جستجو گروپ کی معزز ممبر ستونت کور کی شاہکار تحریروں کا مجموعہ

حصہ اول

حیرت انگیز سچے واقعات

تحریر: ستونت کور

Compiled & Edited By: Zahid

Presented By: Justju Facebook Group

JUSTJU WEBSITE: http://justju.pk
JUSTJU PAGE: https://www.facebook.com/ilmkijustju/
JUSTJU GROUP: https://www.facebook.com/groups/AutoPrince/
JUSTJU TELEGRAM: https://t.me/jusjtu
JUSTJU YOUTUBE: https://m.youtube.com/channel/UCnmsjJFH4pLck4VK9OVk0bw#menu
JUSTJU TWITTER: https://twitter.com/PkJustju/status/1235097536253300736?s=19

فہرست

آپ کو کینسر نہیں ہے

اپریل 2009, روس کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹرز کو ایک غیر معمولی، بلکہ اپنی نوعیت کے پہلے عجیب و غریب کیس کا سامنا کرنا پڑا جب ایک 28 سالہ شخص آرٹیوم سدورکن Artyom Sidorkin کو مخدوش حالت میں ہاسپٹل لایا گیا۔ سدورکن کئی ہفتوں سے سینے میں درد کا شکار تھا جو دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا اور اب ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ تکلیف کی شدت سے نڈھال سدورکن بری طرح سے کھانس رہا تھا اسکا رنگ زرد پڑ رہا تھا اور کھانستے ہوئے اس کے ناک اور منہ سے خون کے چھینٹے نکل رہے تھے۔۔۔ جو کہ ایک بہت بری علامت تھی۔ (بلڈ کینسر کی علامات میں سے ایک)۔۔۔ سدورکن کو فی الفور ICU میں منتقل کر دیا گیا۔ ابتدائی تشخیص کے بعد ڈاکٹرز نے اس شبے کا اظہار کیا کہ سدورکن کے پھیپھڑوں میں رسولی ہونے کا امکان ہے۔

اور، اس کی چھاتی کا ایکسرے لیے جانے کے بعد اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ اس کے پھیپھڑے میں کوئی غیر معمولی چیز پیدا ہو چکی اور بڑھ رہی ہے۔ لیکن، ڈاکٹرز نے کینسر کی حتمی تصدیق کرنے کے لیے سدروکن کی بائیوپسی یعنی پھیپھڑے کے کچھ ٹشوز حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ مرض کنفرم ہو جانے کے بعد علاج کا آغاز کیا جا سکے۔۔ چنانچہ چند روز بعد سدورکن کے پھیپھڑوں کی سرجری کا انتظام کیا گیا۔ آپریشن کے دوران ڈاکٹرز نے دیکھا کہ پھیپھڑوں کا ماس ایک ایسے غلاف کی صورت میں ابھرا ہوا ہے کہ جیسے اس کے نیچے کوئی چیز چھپی ہو۔ تو ڈاکٹرز نے اس کا معائنہ کرنے کے لیے پھیپھڑے کے ٹشوز کو وہاں سے ہٹایا۔ اس کے بعد ڈاکٹرز نے جو دیکھا، انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، یہ ایک پودا تھا۔

5 سینٹی میٹر لمبا وہ پائن کا پودا سدورکن کے پھیپھڑوں میں کیسے پہنچا۔۔۔ شروع میں تو ڈاکٹرز یہ سمجھ بھی نہ پائے۔ لیکن اس سے بھی تشویشناک بات یہ تھی کہ یہ پودا مرجھایا یا مرا ہوا نہیں بلکہ سرسبز تھا اور صاف لگ رہا تھا کہ یہ بڑھ رہا ہے۔

سدورکن کے ساتھ پیش آئے اس حیرت انگیز واقعے کے میڈیا پر آتے ہی سننے والوں کو بھی ایسا ہی شاک لگا کہ جیسے شروع میں ڈاکٹرز کو لگا تھا۔ پھر برطانیہ کے "رائل بوٹینک گارڈنز، لندن" کی ایک ترجمان نے میڈیا کو بتایا کہ "بعض پودوں کے بیجوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ پھیپھڑے جیسی تاریک اور بے ہوا جگہ پر بھی اگ اور بڑھ سکیں۔" پائن کا وہ بیج، کسی طرح سے سانس کے راستے سدورکن کے پھیپھڑے میں چلا گیا تھا اور وہیں اگ گیا، پھر جیسے ہی پائن کے باریک، سوئی نما پتے پھیلنا شروع ہوئے اور انہوں نے سدورکن کی خون کی نسوں کو چھیدنا شروع کیا تو اسے چھاتی کے شدید درد کے ساتھ خون آلود کھانسی شروع ہوگئی۔ "آپ کو کینسر نہیں ہے، بلکہ آپ کو ایک درخت تھا۔" ہوش میں آنے کے بعد سدورکن کو بتایا گیا۔ اس سرجری کے دوران اس پودے کو نکال دیا گیا تھا۔ سدورکن کے پھیپھڑے میں اگے اس پودے کی تصاویر گرافک ہونے کی وجہ سے میں پوسٹ نہیں کر رہی تاہم آپ گوگل پر انہیں Tree in Lung لکھ کے سرچ کرنے سے دیکھ سکتے ہیں۔ اور ہاں۔۔۔۔ احتیاط کیجئیے کہ کبھی کوئی بیج، کوئی بھی بیج سانس کے راستے آپ کے وجود میں نہ چلا جائے۔

بشکریہ: ڈیلی میل، گارڈئین، BBC

تنہا

2013-امریکی ریاست Maine کے ایک جنگلی خطے "نارتھ پونڈ" میں قائم ایک سرکاری کیمپ میں چوری کی وارداتیں عام ہوتی جارہی تھیں۔ یہ سرکاری کیمپ دراصل اس علاقے میں شکار، ماہی گیری، ٹریکنگ، ہائیکنگ اور کیمپنگ کرنے کی خاطر آنے والے افراد کی سہولت کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ چوری کی یہ وارداتیں صرف کیمپ میں ہی نہیں بلکہ جنگل کے قریب واقعہ گھروں، کیبنز اور جنگل میں کیمپرز کی طرف سے لگائے گئے ٹینٹوں میں بھی عرصہِ دراز سے جاری تھیں۔ تقریباً تیس سال سے جاری چوری کی ان وارداتوں میں غیر معمولی بات یہ تھی کہ اس دوران کبھی کوئی قیمتی چیز چوری نہ ہوئی تھی بلکہ اکثر و بیشتر وہ نامعلوم چور کھانے پینے کی چیزیں، فروٹ، چپس، کینڈیز، دودھ اور جوس کے ڈبے اور عام استعمال کی چیزیں جیسے کپڑے، جوتے وغیرہ ہی چرا کے لیجاتا تھا۔ اس عرصے کے دوران بہت کم ہی ایسا ہوا کہ کسی نے پولیس کو چوری کی اطلاع کی ہو کیونکہ فروٹ یا کینڈیز وغیرہ کی چوری کوئی اتنا بڑا نقصان یا اتنا سنجیدہ مسئلہ نہ تھا۔

لیکن سرکاری کیمپ میں ہونے والی اسی طرز کی چوریاں نہ صرف اب عام ہو چکی تھیں بلکہ سرکاری پراپرٹی ہونے کی وجہ سے وہاں ہونے والا کوئی بھی جرم عام حالت سے زیادہ سنجیدگی سے لیا جاتا تھا۔ چنانچہ 2013 میں نارتھ پونڈ پولیس نے کیمپ کے کچھ حصوں میں کیمرے اور موشن سینسرز نصب کر دیے تاکہ اس مبینہ چور کو گرفتار کیا جاسکے۔

4 اپریل 2013 کی ایک گھپ تاریک رات کو کیمپ کے قریب موجود پولیس چوکی کو ایک کیمپ میں نصب موشن سینسرز کی طرف سے ایک الارم موصول ہوا۔۔۔ موشن سینسرز سے کیمپ میں الارم نہیں بجتا تھا بلکہ پولیس چوکی میں وہ الارم ٹرانسمٹ ہوتا

تھا۔ الارم کا مطلب تھا کہ رات کے اس پہر کیمپ میں کوئی غیر معمولی حرکت ڈیٹیکٹ ہوئی ہے۔ چنانچہ ڈیوٹی پر موجود سارجنٹ ٹیری ہیوگس فوراً اپنا پسٹل اور فلیش لائٹ سنبھالے کیمپ کی طرف بڑھا۔ 4 منٹ میں ہی ٹیری، کیمپ کے صدر دروازے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس نے تاریکی میں ایک سیاہ ہیولے کو دروازے سے نکل کر جنگل کی طرف بڑھتے دیکھا، ٹیری اچانک اس کے سامنے آ گیا اور اس نے فلیش لائٹ آن کر کے روشنی ٹھیک اس کے چہرے پر ڈالی اور ساتھ ہی چلا کر اسے سرنڈر کرنے کو کہا۔ اس ادھیڑ عمر شخص نے بغیر کوئی مزاحمت کیے سرنڈر کر دیا۔ تلاشی لینے پر اس کی جیبوں سے بس چاکلیٹس، کینڈیز اور ایسا ہی کھانے پینے کا سامان بر آمد ہوا۔۔ مزید تفتیش کے لیے ٹیری اسے گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ پولیس چوکی لے گیا۔

وہاں تعینات پولیس اہلکاروں نے جب ٹیری سے سوالات کا آغاز کیا تو کئی منٹ تو وہ کچھ بول بھی نہ پایا، پھر جب اس نے بولنا شروع کیا تو انتہائی ٹوٹے پھوٹے اور آدھے ادھورے الفاظ میں بول رہا تھا جیسے اسے بولنا ہی نہ آتا ہو۔ کئی دفعہ اسے آگے یہ بھی نہیں پتا ہوتا تھا کہ اب آگے کیا بولنا ہے یا اس موقعے پر کونسے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ اس کا نام Christopher Thomas Knight ہے۔ اور اس کی تاریخِ پیدائش 7 دسمبر 1965 ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ کہاں رہتا ہے تو اس نے بتایا کہ اس کی رہائش گاہ جنگل میں ہے۔ پولیس نے جب اس سے استفسار کیا کہ وہ کب سے جنگل میں ہے۔۔۔ تو اس نے کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد کہا کہ "جس سال چرنوبل کا سانحہ ہوا تھا۔" گویا وہ 1986 سے اسی جنگل میں رہائش پذیر تھا۔۔ پہلے پہل تو پولیس کو اس کی اس کہانی پر یقین ہی نہ آیا۔۔ لیکن پھر اگلے روز جب تھامس نے جنگل میں اپنے ٹھکانے تک پولیس کی راہنمائی کی اور پولیس نے وہاں کا وزٹ کیا تو انہیں تھامس کی اس داستان پر یقین آ گیا۔۔ 27 برس تک اس گھنے دلدلی جنگل میں رہنا آسان نہ تھا کہ جس میں سرما کی راتوں کو درجہ حرارت منفی 20 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔

جب اس سے استفسار کیا گیا کہ یہ 27 سال اس نے جنگل میں کیسے گزار دیے؟ تو اس نے بتایا کہ وہ جنگل کے چشموں سے پانی حاصل کرتا تھا اور جنگل میں پھل، شہد، مشروم وغیرہ تلاش کرنے کے علاوہ جنگل کے آس پاس کے کیبنز اور کیمپس سے چیزیں چوری کر کے گزارہ کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس سارے عرصے کے دوران کسی بھی دوسرے شخص سے اس کی بات چیت 9 سال قبل ہوئی کہ جب ایک ٹریکر نے اسے بھی کوئی ٹریکر یا کیمپر سمجھ کر اسے ہیلو اور گڈ مارننگ کہا۔۔ اس کے علاوہ ان 27 برس میں کسی سے اس کی بات نہ ہوئی۔ تھامس کی صحت بھی ٹھیک تھی، دماغی توازن بھی پرفیکٹلی درست تھا یہاں تک کہ اس کا حلیہ بھی درست تھا۔۔۔ تھامس نے بتایا کہ وہ خود کو فٹ رکھنے کے لیے ورزش اور جاگنگ باقاعدگی سے کرتا تھا اور قریبی تالابوں، چشموں سے نہا دھو کر اور وہیں اپنے کپڑے دھو کر خود کو صاف رکھتا تھا۔۔ یہاں تک کہ کئی سال وہ چوری شدہ ریزر بلیڈز سے شیو بھی کیا کرتا تھا۔ تفتیش کے دوران تھامس نے 1000 چوری کی وارداتوں کا اعتراف کیا۔ چوری کا مقدمہ عدالت میں چلنے کے بعد تھامس کو 7 مہینے قید کی سزا

ہوئی۔

ساڑھے تین ماہ بعد بری کر دیے جانے کے بعد تھامس نے واپس جنگل نہ جانے کا فیصلہ کیا اور آج تھامس Maine میں ہی رہائش پذیر ہے اور ایک ورکشاپ میں جاب کرتا ہے۔ آخر تم نے معاشرے کو ترک کر کے اتنا عرصہ جنگل میں کیوں گزارا؟ تو اس نے بتایا کہ وہ جدید دور کے معاشرے اور معاشرتی روٹین سے تنگ تھا اور ایک پر سکون زندگی چاہتا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جنگل میں اس کا وقت اچھا گزرا اور وہ اس بات پر قطعی شرمندہ نہیں ہے۔ تھامس کو عوام کی طرف سے the North Pond Hermit کا خطاب ملا۔

2017 میں اس کی زندگی پر لکھی گئی کتاب The Stranger In The Woods شائع کی گئی۔

آزاد

مائیکل اینڈریسن کی پیدائش 1977 میں ہوئی، اس کا تعلق امریکی ریاست Missouri سے تھا۔

وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور وہ بچپن سے ہی بری صحبت کا شکار رہا۔

لڑکپن تک پہنچتے پہنچتے مجرمانہ روح اس میں پوری طرح سرائیت کر چکی تھی اور وہ اب چھوٹی موٹی چوریوں کے علاوہ ڈکیتیوں میں بھی ملوث رہنے لگا تھا۔

15 اگست 1999 کی رات مائیکل نے برگر کنگ فاسٹ فوڈ فرنچائز کے ایک مینیجر کو اس وقت لوٹ لیا جب وہ ایک بنک کے نائیٹ ڈیپازٹ باکس میں رقم داخل کر رہا تھا۔ اس نے گن پوائنٹ پر مینیجر کو دھمکا کر اس سے 2 ہزار ڈالر کی رقم لوٹی اور فرار ہو گیا۔۔۔ لیکن فرار ہوتے وقت ایک عینی شاہد نے اس کی کار کا نمبر دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس نے 2 دن میں ہی اسے دبوچ لیا اور اس طرح مائیکل گرفتار ہو گیا۔ مارچ 2000 میں عدالت نے مائیکل کو ڈاکہ زنی، ہراسانی اور ناجائز اسلحہ رکھنے سمیت کئی دفعات کے تحت 13 سال قید کی سزا سنا دی۔ مائیکل کو 2002 میں مائیکل نے عدالت کے اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی ساتھ ہی ضمانت پر رہائی کے لیے بھی اپلائے کر دیا۔ عدالت میں اس کی درخواست کو سماعت کے لیے منظور کر لیا گیا ساتھ ہی اسے ضمانت پر عارضی رہائی بھی دے دی گئی۔ لیکن۔۔۔ ایک ماہ کی سماعت کے بعد ہی مائیکل کی اپیل خارج کر دی گئی، اب اسے 2013 تک کا بقایا وقت جیل میں ہی گزارنا تھا۔ اس نے اپنے وکیل سے ملاقات کر کے آگے کے معاملات کے بارے میں پوچھا تو اسے جواب دیا کہ اب کسی بھی وقت پولیس اہلکار تمہارے پتے پر آ کر تمہیں گرفتار کر لیں گے اور تمہیں واپس جیل میں بھیج دیا جائے گا۔ ایک سزا یافتہ شخص جس نے دو برس کی قید کے بعد ایک ماہ کا خوشگوار وقت جیل سے باہر گزارا ہو اور اب سے مزید 11 برس کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جانا ہو۔۔۔ اس کے غم و اندوہ اور پریشانی کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔

کئی گھنٹے گزر گئے لیکن کوئی پولیس اہلکار مائیکل کو گرفتار کرنے نہ آیا، پھر سے یہ گھنٹے دنوں میں بدل گئے اور اب تک پولیس کا کوئی نام و نشان نہ تھا، جب یہ ہفتے مہینوں میں بدلے تو مائیکل کو کچھ "گڑبڑ" کا احساس ہوا کہ شاید پولیس کسی قانونی تاخیر کی وجہ سے اب تک اسے گرفتار نہیں کر رہی۔ لیکن جب یہ مہینے، ایک برس میں بدل گئے تو اب وہ باقاعدہ حیرت میں مبتلا تھا کہ کیا اسے عدالتی حکم کے برعکس بری اور پھر رہا کر دیا گیا ہے؟ وہ بھی بغیر کسی قانونی پراسیس کے۔ خیر، مائیکل نے پیڑ گننے کے بجائے آم کھانے کو ترجیح دی۔ مائیکل جیل میں ہی اس بات کا عہد کر چکا تھا کہ اب وہ کبھی کسی جرم یا مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہو گا۔۔۔ اس غیر متوقع

رہائی کے بعد بھی اس نے اپنا عہد قائم رکھا اور کنسٹرکشن کا کام شروع کیا۔

2007 میں مائیکل نے اپنی ذاتی کنسٹرکشن کمپنی بنام Anderson Construction and Investment قائم کی۔ اس نے شادی کی۔ قدرت نے اسے 3 بچوں سے نوازا۔ اس کی کمپنی اور کاروبار اچھا خاصا کامیاب جارہا تھا اور اب اس کا شمار متمول اور خوشحال گھرانوں میں ہوتا تھا۔ وہ انتہائی کامیاب، خوشحال اور پر سکون گزار رہا تھا کہ 2013 میں اچانک۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ جب 2002 میں اس کی اپیل خارج کرتے ہوئے عدالت نے اسے دوبارہ گرفتار کرنے اور جیل بھیجنے کا حکم جاری دیا تو میزوری پولیس کے سسٹم اور ریکارڈ کی ایک غلطی کی وجہ سے متعلقہ پولیس افسر یہی سمجھے کہ "مائیکل پہلے ہی گرفتار ہوچکا ہے اور اب میزوری سٹیٹ جیل میں ہے۔". لیکن ریکارڈ کی اس فاش غلطی کی وجہ سے مائیکل کو گرفتاری سے بچنے اور آزاد زندگی گزارنے کا موقع مل گیا ۔ اور اس نے خاموشی سے اس موقع سے فائدہ اٹھالیا۔

جب 2013 میں متعلقہ پولیس افسر ، میزوری سٹیٹ جیل میں پہنچا تاکہ سزا پوری ہوجانے کے بعد مائیکل کو جاکر رہا کرسکے۔۔۔ تو اسے جیل حکام نے بتایا کہ اس نام کا کوئی قیدی جیل میں موجود نہیں۔ اس نے گھبراہٹ اور عجلت میں جب جیل کے ریکارڈز کو چیک کیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس نام اور نمبر کا قیدی 2002 کے بعد کبھی اس جیل میں رہا ہی نہیں ہے۔ واپس آنے پر جب اس پولیس افسر نے سابق ریکارڈ کا سٹنگ آپریشن کیا تو ان سب پر انکشاف ہوا کہ مائیکل کو دوبارہ کبھی گرفتار ہی نہ کیا گیا تھا جیل بھیجنا تو دور کی بات۔ اپنی غلطی کا ازالہ کرتے ہوئے پولیس نے اب جاکر مائیکل کو گرفتار کرلیا، اور مائیکل کا وہ بھیانک خدشہ درست ثابت ہوگیا کہ کبھی نہ کبھی پولیس اپنی

اس غلطی کا ازالہ کرنے ضرور آئے گی۔۔۔۔ اور ایسا ہی ہوا۔
مائیکل کی گرفتاری کے بعد جب اس پولیس کی اس دلچسپ غلطی کی روداد میڈیا اور عوام تک پہنچی تو عوامی حلقوں سے مائیکل کے حق میں آوازیں بلند ہوئیں، عوام کا موقف یہ تھا کہ "مذکورہ غلطی پولیس سے سرزد ہوئی جس میں مائیکل کا کوئی قصور نہیں۔۔۔۔ مائیکل اب ایک بدلا ہوا انسان ہے۔ ایک مجرم نہیں بلکہ ایک معزز کاروباری شخص ہے۔ اسے ایک موقع ضرور ملنا چاہیے". چنانچہ یہ مقدمہ پھر سے عدالت کی زینت بن گیا۔ چندماہ مائیکل کے پولیس کی کسٹڈی میں رہنے کے بعد 2014 میں مقدمے کی سماعت کا آغاز ہوا۔ جج نے صرف 10 منٹ کی پیشی کے بعد مائیکل کو باعزت بری کر دیا۔
مائیکل اب ایک آزاد انسان، ایک کامیاب بزنس مین اور امریکہ کا ایک معزز شہری ہے۔

مسیحا

ہنری ٹینڈی Henry Tandy جنگِ عظیم اول میں ایک برطانوی فوجی تھا جس نے اپنی دلیری اور جنگی مہارت کی وجہ سے برطانیہ کے سب سے بڑی عسکری ایوارڈ "وکٹوریا کراس" سمیت کئی اعزازات اپنے نام کیے۔

لیکن اس کی زندگی اور ملٹری سروس کا ایک واقعہ ناقابلِ فراموش ہے۔ 1918 میں وہ شمالی فرانس میں تعینات تھا جہاں اس کی ڈیوٹی رات کے وقت تھی۔ 28 ستمبر 1918 کی تاریک، دھند آلود اور سرد رات میں ہنری شمالی فرانس کے ایک گاؤں Marcoing کے نزدیک اپنی خندق میں ڈیوٹی پر تھا کہ اس نے مخالف سمت سے کسی وجود کو خندق کی جانب حرکت کرتے دیکھا۔ ہنری نے فوراً اپنی تفنگ سیدھی کی اور شست باندھ کر اس کا نشانہ لینے لگا۔۔۔۔ لیکن اس نے گولی نہ چلائی۔ کیونکہ آخری وقت میں اسے یہ احساس ہوا کہ "ممکن ہے یہ کوئی جرمن دشمن نہ ہو بلکہ کوئی زخمی فرانسیسی سپاہی ہو جو واپس اپنی پوزیشن کی تلاش میں بھٹک رہا ہو۔"

چنانچہ اس نے تفنگ کا رخ اس کی جانب کیے رکھا لیکن فائر نہ کیا۔ یہاں تک کہ لنگڑاتا ہوا وہ زخمی شخص اتنا نزدیک پہنچ گیا کہ چاند کی مدھم روشنی میں ہنری صاف دیکھ سکتا تھا کہ وہ ایک جرمن سپاہی ہے (یونیفارم کی وجہ سے). اس کی چال سے صاف ظاہر تھا کہ وہ نہ صرف زخمی ہے بلکہ بری طرح سے اگیزاسچن کا شکار ہے۔ ہنری تفنگ کے گھوڑے پر انگلی کا دباؤ بڑھانے کی لگا تھا کہ اس کے دل میں انسانیت کی ایک چنگاری جل اٹھی جس نے اس کے دل کو ترحم کے نور سے روشن کر دیا۔ تب تک زخمی جرمن سپاہی بھی اس خندق اور ہنری کی تھی بندوق کو دیکھ چکا تھا اور وہیں رک گیا تھا۔ ہنری نے اپنی خندق میں اِدھر اُدھر دیکھا کہ اس کا کوئی اور سپاہی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ لیکن کوئی بھی نزدیک موجود نہ تھا۔ ہنری نے ہاتھ کے اشارے سے، موت کے لیے خود کو ذہنی طور پے تیار کر چکے دشمن سپاہی کو واپسی کا اشارہ کرتے ہوئے وہ سمت دکھائی کہ جس طرف جرمن خندقیں موجود تھیں۔ زخمی جرمن سپاہی نے ہاتھ کے اشارے سے اس فرشتہ صفت مسیحا کا شکریہ ادا کیا اور واپس اپنی صفوں کی طرف مڑ گیا۔ اس واقعے کو ہم عسکری تاریخ میں رحم و ترحم کا ایک یادگار واقعہ قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن۔ ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔ ہنری نے جس جرمن سپاہی کو زندہ چھوڑا تھا اس کا نام Adolph Hitler تھا۔

روپوش

وارن فیملی وینکوور، کینیڈا میں مقیم متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک فیملی تھی۔ وارن شادی شدہ تھا اور اس کی بیوی رُوتھ سے اس کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا جن کے نام بالترتیب پالین اور ٹیڈ تھے۔ 1970 میں پالین کی عمر محض 5 برس تھی جب اس خاندان کو ایک ٹریجڈی نے آن گھیرا۔

"What happens when 'Fake News' takes over your family?
This harrowing true story reads like a psychological thriller—I was haunted by it."
PLUM JOHNSON, author of *They Left Us Everything*
Pauline Dakin
RUN
HIDE
A Memoir of a Fugitive Childhood
REPEAT
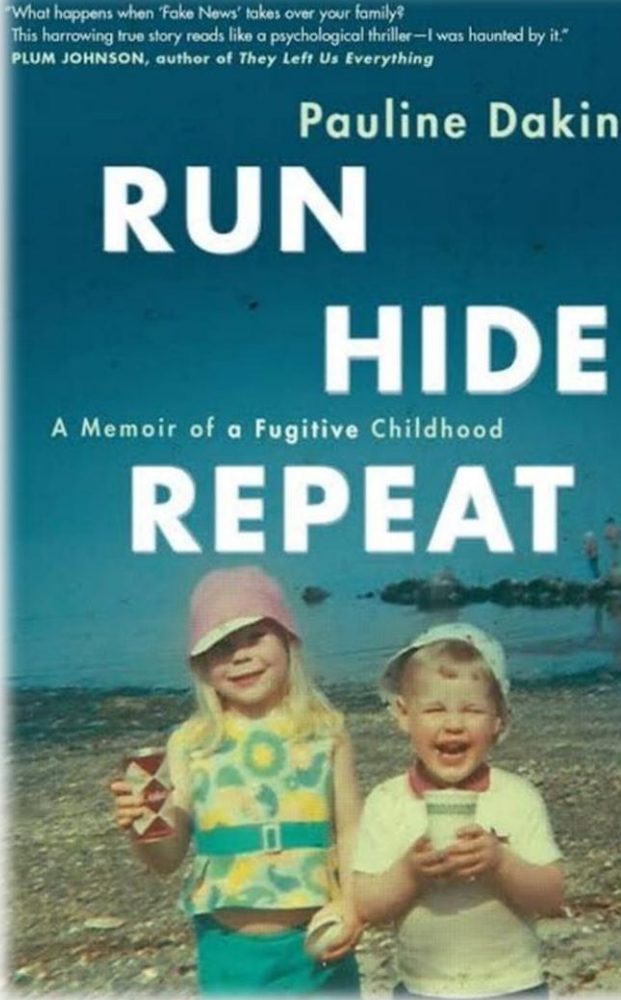
روتھ نے بغیر کسی ٹھوس وجہ کے وارن سے علیحدگی اختیار کرلی اور بغیر وارن یا کسی کو بھی اطلاع کیے اپنے دونوں بچوں کو لے کر وینکوور کے ایک نئے ٹاؤن میں منتقل ہوگئی جو اس کے گزشتہ گھر سے کئی گھنٹوں کے فاصلے پر تھا۔

تینوں ماں بچوں نے اس نئے مکان میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔۔۔ لیکن پالین نے شروع سے ہی نوٹ کیا کہ اس ماں اکثر نامعلوم خوف و خدشات کا شکار رہتی تھی، وہ ہر وقت ہر معاملے میں بیحد محتاط رہتی تھی اور اس کا رویہ بالکل ناقابلِ فہم تھا۔ لیکن ان کی زندگی انہی حالات میں، بغیر کسی بڑے مسئلے یا پریشانی کے چلتی رہی۔۔۔

1974 میں جب پالین کی عمر 9 برس تھی تو ایک روز بغیر کسی مستند وضاحت کے روتھ نے ایک مرتبہ پھر اپنے بچوں کو ساتھ لیا اور اب کی بار ان کی منزل 1609 کلومیٹر دور واقعہ شہر "ونیپگ" تھا۔۔۔

ان کی زندگی کا اگلا فیز ونیپگ میں شروع ہوا جہاں اب وہ ایک نئے، چھوٹے سے گھر میں رہائش پذیر تھے۔۔۔ اس شہر میں بھی روتھ کا رویہ کافی عجیب وغریب تھا۔ اب بھی وہ مسلسل کسی انجان خوف میں مبتلا رہتی تھی، پالین نے اپنی ماں کو کئی مرتبہ کھڑکی کی اوٹ سے کافی دیر تک باہر تاکتے دیکھا جیسے وہ گھر سے باہر نگاہ رکھے ہوئے ہو. کئی مرتبہ وہ فریج میں رکھی کھانے پینے کی چیزیں اٹھا کے ڈسٹ

بن میں ضائع کر دیا کرتی تھی۔۔۔صاف ظاہر تھا کہ کوئی انجانا خوف اسے ہر وقت لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔روتھ ایک علاقے میں رہتے ہوئے بھی پالین اور ٹیڈ کے سکول بار بار بدلوا دیتی تھی۔11 سال کی عمر تک پالین 6 سکول بدل چکی تھی۔مزید چند برس ونیپگ میں قیام کے بعد ایک روز پالین نے اچانک سے روتھ کو بتایا کہ اب وہ سب کینیڈا کے بالکل پرلے کنارے پر واقعہ New Brunswick میں منتقل ہو رہے ہیں۔لیکن اب کی بار پالین جو کہ قدرے میچور ہو چکی تھی اس نے اپنی ماں سے یہ استفسار شروع کر دیا کہ وہ صاف صاف انہیں بتائے کہ آخر کیا مسئلہ ہے۔۔۔ہم خانہ بدوشوں اور روپوشوں جیسی متحرک اور محتاط زندگی کیوں بسر کر رہے ہیں۔لیکن روتھ نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ " صحیح وقت آنے پر سب بتادوں گی۔"

اس سارے عرصے کے دوران پالین اور ٹیڈ کی اپنے باپ وارن سے بھی نہ تو کوئی ملاقات ہوئی نہ کوئی رابطہ اور نہ ہی وہ جانتے تھے کہ وارن کہاں ہوتا ہے۔۔۔

"نیو برنزوک" میں منتقل ہونے کے بعد ان کی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آگیا، یہاں وہ کافی طویل عرصہ رہائش پذیر رہے یہاں تک کہ پالین نے 23 برس کی عمر میں نیو برنزوک کی ایک یونیورسٹی سے ہی گریجویشن ڈگری حاصل کی۔لیکن، اس عرصے کے دوران ان کے گھر میں ایک ایسے شخص کا آنا جانا شروع ہو گیا جسے وہ لوگ شروع دن سے جانتے تھے۔اور یہ تھا Stan Sears جو کہ وینکوور میں تب کے زمانے میں ایک چرچ لیڈر رہا کرتا تھا جب پالین کی فیملی وینکوور میں آباد تھی۔

اب سٹین اکثر و بیشتر ان کے گھر آتا رہتا تھا۔نیو برنزوک میں آکر بھی روتھ کے انجانے خوف اور خدشات میں کوئی کمی نہ آپائی تھی وہ اب بھی پہلے کی طرح محتاط اور تناؤ آمیز زندگی گزار رہی تھی۔

پالین اب گریجویشن کے بعد ایک مقامی اخبار میں کام کر رہی تھی اور جاب کی وجہ سے گھر سے دور، اخبار کے دفتر کے نزدیک منتقل ہو گئی تھی۔پھر 1988 میں ایک روز روتھ نے پالین کو فون کیا اور وہ بات کہی کہ جس کا انتظار وہ بچپن سے کر رہی تھی۔۔۔روتھ نہ بتایا کہ وہ اب پالین کو ساری حقیقت بتانے پر آمادہ ہے کہ ان کی فیملی اتنے برس سے بھاگتے اور چھپتے ہوئے کیوں گزارہ کر رہی ہے۔روتھ نے پالین کو گھر کے بجائے ایک ہوٹل کا ایڈریس دیتے ہوئے وہاں پہنچنے کا کہا۔جب پالین مطلوبہ ہوٹل میں پہنچی اور بتائے گئے کمرے میں پہنچی تو وہاں روتھ کے ساتھ, ان کا پرانا فیملی فرینڈ سٹین بھی موجود تھا۔روتھ اور سٹین نے ان کی مفرور اور روپوش زندگی کے بارے میں جو انکشافات کیے ان کا خاصہ کچھ یوں بنتا ہے،"سٹین نے پالین کو بتایا کہ پالین کا باپ وارن دراصل ایک خطرناک جرائم پیشہ گینگ کا حصہ تھا جو کہ ان گنت قتل کی وارداتوں سمیت انتہائی سنگین جرائم میں ملوث ہے۔یہ کہ روتھ اپنے شوہر اور اس کے گینگ کے بارے کافی کچھ جان چکی تھی اور اس بات کا علم وارن کو ہو چکا تھا۔وارن اور اس کا گینگ روتھ، پالین اور ٹیڈ کو قتل کر دینے کے درپے ہو چکا تھا اور روتھ کو وقت رہتے خبر ہو گئی چنانچہ روتھ اپنے بچوں کو ساتھ لے کر فرار ہو گئی۔انہیں ہمیشہ مافیا

کی طرف سے خطرہ رہا اور اسی لیے وہ اتنی ڈھکی چھپی، محتاط اور متحرک زندگی جیتے آئے ہیں۔ اور آخر میں سٹین نے بتایا کہ اب وہ اور روتھ خوف اور ہراس بھری اس زندگی سے بری طرح سے تنگ آچکے ہیں۔ لہذا وہ حکومت کے ایک خاص پروگرام کا حصہ بننا چاہتے ہیں جو کہ ایسے جرائم متاثرہ لوگوں کی حفاظت کے لیے بنایا گیا ہے کہ جن کی جان کو خطرہ ہو۔۔۔ اس پروگرام کے تحت حکومت متاثرہ خاندان پر خفیہ پولیس کے کچھ اہلکاروں کی ڈیوٹی لگا دیتی ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے انہیں نگرانی میں رکھیں اور خفیہ رہ کر ان کی حفاظت کریں۔۔۔ اس طرح متاثرہ فیملی کو مکمل تو نہیں مگر کافی حد تک حفاظت اور سکون میسر آجاتا ہے۔

اپنے متعلق سٹین نے یہ بتایا کہ روتھ سے دوستی ہونے کی وجہ سے وہ بھی مافیا اور وارن کی ہٹ لسٹ پر تھا اور اتنا عرصہ وہ بھی مافیا سے چھپتا چھپاتا انہی کے ساتھ ساتھ ایک سے دوسرے ٹاؤن میں منتقل ہوتا آرہا ہے۔" پالین یہ سب سن کر شدید صدمے اور پریشانی کا شکار ہوگئی۔ وہ جان گئی تھی کہ چوبیس گھنٹے ان کے سروں پر مافیا کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اپنے باپ کی حقیقت جان کر بھی اسے گہرا صدمہ ہوا تھا۔ سٹین نے انہیں بتایا کہ اس نے حکومت کے اس پروٹیکشن پروگرام میں شامل ہونے کے لیے درخواست دی ہے اب اسے اپروول کا انتظار ہے۔ سٹین کے کے کہنے پر پالین نے اپنی جاب اور رہائش گاہ دونوں تبدیل کر دیں اور اسی نیو برنزوک میں ہی ایک نئی لوکیشن پر منتقل ہوگئی۔۔۔

پالین نے ایک نئی جاب اختیار کرلی۔ بعد میں اس نے شادی بھی کرلی۔۔۔ سٹین اب روتھ کے پاس ہی آکے رہنے لگا تھا اور وہی انہیں مافیا کی دسترس سے بچ کر رہنے سے متعلق ہدایات دیتا رہتا تھا۔

کچھ عرصے بعد سٹین نے ان سب کو بتایا کہ سرکاری پروٹیکشن پروگرام میں دی گئی ان کی درخواست منظور ہوچکی ہے اور اب انہیں پولیس کی خفیہ پروٹیکشن اور نگرانی حاصل رہے گی۔۔۔ اس نے کہا کہ اس کے باوجود بھی ان سب کو ہوشیار رہنا ہوگا کیونکہ مافیا کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ پالین جو کہ اب جوان اور میچور تھی اسے سٹین و روتھ کی سنائی گئی کہانی میں کئی بڑے جھول اور سقم محسوس ہونے لگے۔۔۔ ساتھ ہی سٹین کی طرف سے دی جانے والی ہدایات اسے کھوکھلی اور بے مقصد محسوس ہونے لگیں۔

آخرکار 1993 میں ایک دن پالین نے روتھ و سٹین کی بتائی کہانی کو آزمانے کا سوچا، اس نے اپنی ماں کو کال کی اور بتایا کہ "آج گھر واپسی پر مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری غیر موجودگی میں کوئی گھر میں گھسا ہو اور یہاں کی تلاشی لے کر گیا ہو."

یہ سنتے ہی روتھ پریشان ہوگئی اور اس نے کہا کہ وہ سٹین سے رابطہ کرکے اسے اس واقعہ سے آگاہ کرتی ہے اور اسے کال بیک کرے گی۔ چند گھنٹے کے بعد پالین کو روتھ کی کال موصول ہوئی اس نے بتایا کہ سٹین نے متعلقہ پولیس اہلکاروں سے اس سلسلے میں رابطہ کیا اور انہوں نے اسے بتایا کہ "پالین کی غیر موجودگی میں مافیا کے ایک نہیں بلکہ دو ممبر اس کے گھر میں داخل ہوئے تھے اور پولیس کی طرف سے گھر کی مسلسل نگرانی کیے جانے کی وجہ سے اب وہ دونوں زیرِ حراست ہیں۔".

جواب میں پالین نے اپنی ماں کو بتایا کہ ایسا سرے سے کچھ ہوا ہی نہیں اور یہ واقعہ محض فرضی تھا۔

ثابت ہو چکا تھا کہ روتھ اور سٹین جھوٹ بول رہے ہیں۔۔۔ اور نجانے کب سے جھوٹ ہی بولتے آئے ہیں!!!!

لیکن یہ سب کیوں اور کب سے چل رہا ہے۔۔۔۔ پالین نے فیصلہ کیا کہ وہ اس راز سے پردہ اٹھا کے دم لے گی۔

اس نے اپنے خاوند کو شروع تا آخر اس سارے معاملے سے آگاہ کیا اور اس سلسلے میں اس کی مدد مانگی۔

کئی ماہ کی گہری چھان بین، پولیس اور متعلقہ اداروں سے رابطے اور تفصیلی گفتگو اور متعدد نفسیاتی معالجین کے سامنے اس کیس کے تمام مندرجات تفصیل سے رکھنے اور ڈسکس کرنے کے بعد عقدہ یہ کھلا کہ سٹین دراصل delusional disorder نامی ایک کمیاب مگر خطرناک نفسیاتی عارضے کا شکار ہے۔۔۔ اس عارضے کا شکار شخص انتہائی گہرائی میں طویل مدت کے لیے ایک فرضی سیچویشن کو تصور کر کے اسے خود پے طاری کر لیتا ہے اور پھر جب تک وہ قائم رہتا ہے وہ شخص اسی فرضی سیچویشن کے تحت جیتا اور ہر کام اسی طرح سے سرانجام دیتا ہے۔ وارن ایک کامیاب بزنس مین تھا، جس کا مافیا کے ساتھ کسی نوعیت کا کوئی تعلق نہ تھا۔ سٹین نے ہی روتھ کو ورغلا کر اس بات کا یقین دلایا کہ وارن مافیا کا کارندہ ہے اور وہ مافیا کی ایماء پر اسے اور اس کے بچوں کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ نفسیاتی مریض تو سٹین تھا، پھر روتھ اس کے شکنجے میں کیسے آگئی صحیح سلامت ہوتے ہوئے بھی۔ اس کا جواب ماہرین اور نفسیاتی معالجین نے یہ دیا کہ اگر دو لوگ آپس میں بہت قریبی طور پر انوالو ہوں تو ایک کا نفسیاتی مسئلہ اپنی تمام تر علامات کے ساتھ دوسرے میں منتقل ہو سکتا ہے اور اس کیفیت کو folie à deux کہا جاتا ہے۔

سٹین delusional disorder کا شکار تھا اور روتھ کے ساتھ وہ عرصہ دراز سے تعلق میں تھا۔۔۔ اسی سے یہ مرض روتھ میں بھی منتقل ہو گیا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا ان دہائیوں میں وہ سب کا سب صرف سٹین کے دماغ کا فتور تھا جس کا حقیقت میں کوئی وجود نہ تھا۔

نہ تو وارن کوئی مجرم تھا۔ نہ ہی اس سارے عرصے کے دوران کوئی ان کے تعاقب میں تھا۔ اور نہ ہی کوئی ایسا سرکاری پروٹیکشن پروگرام وجود رکھتا تھا۔

حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد پالین اور ٹیڈ کی زندگی آہستہ آہستہ معمول پر آتی چلی گئی اور انہیں اس تناؤ بھری غیر متوازن زندگی سے نجات مل گئی جسے وہ انتہائی بچپن سے جیتے آرہے تھے۔ 2017 میں پالین نے اپنی یہ خود نوشت، اپنی کتاب Run Hide, Repeat میں رقم کی۔۔۔ یہ کتاب امریکہ میں "بیسٹ سیلر" رہ چکی ہے۔

آدم خور

شیشی جیماChichi Jima جاپان کا ایک جزیرہ ہے جو مین لینڈ جاپان سے تقریباً980 کلومیٹر کے فاصلے پر واقعہ ہے۔35 مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل اس جزیرہ کی آبادی2000 نفوس پر مشتمل ہے۔لیکن آج، پرامن نظر آنے والا یہ جزیرہ دوسری جنگ عظیم میں نہ صرف ایک خون آلود اور تباہ کن میدانِ جنگ تھا بلکہ ایک ایسا خوفناک راز اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا، جی کی یاد امریکی فوج کے لیے ہمیشہ ایک ڈراؤنے خواب کی مانند رہے گی۔

جولائی 1944, جاپان کے خلاف امریکہ کی فل سکیل جنگ اپنے عروج پر تھی اور جاپان کو ایک کے بعد ایک محاذ پر شکست کا سامنا تھا۔

جزیرۂ شیشی جیما پر جاپانی فوج نے اپنی کچھ مظبوط ترین عسکری تنصیبات بشمول 2 ریڈیو ٹاورز قائم کر رکھی تھیں اور یہ جزیرہ سٹریٹجک اعتبار سے جاپان کے لیے بہت اہم تھا۔جاپانیوں کی کمیونیکیشن لائنز تباہ کرنے کے لیے امریکی افواج نے اس جزیرے پر موجود دونوں ریڈیوٹاورز کو بمباری کر کے تباہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔

لیکن۔۔۔اس پورے جزیرہ کے چپے چپے پر جاپانیوں نے طیارہ شکن گنز کا جال بچھا رکھا تھا۔جزیرہ کی فضاؤں میں پہنچ کر مطلوبہ ہدف پر بم گرا پانا تو درکنار ، جزیرے کے قرب پھٹک پانا بھی کسی دشمن جہاز کے لیے آسان نہ تھا۔لیکن تمام خطرات کے باوجود امریکہ نے بحرالکاہل میں تعینات اپنے طیارہ بردار
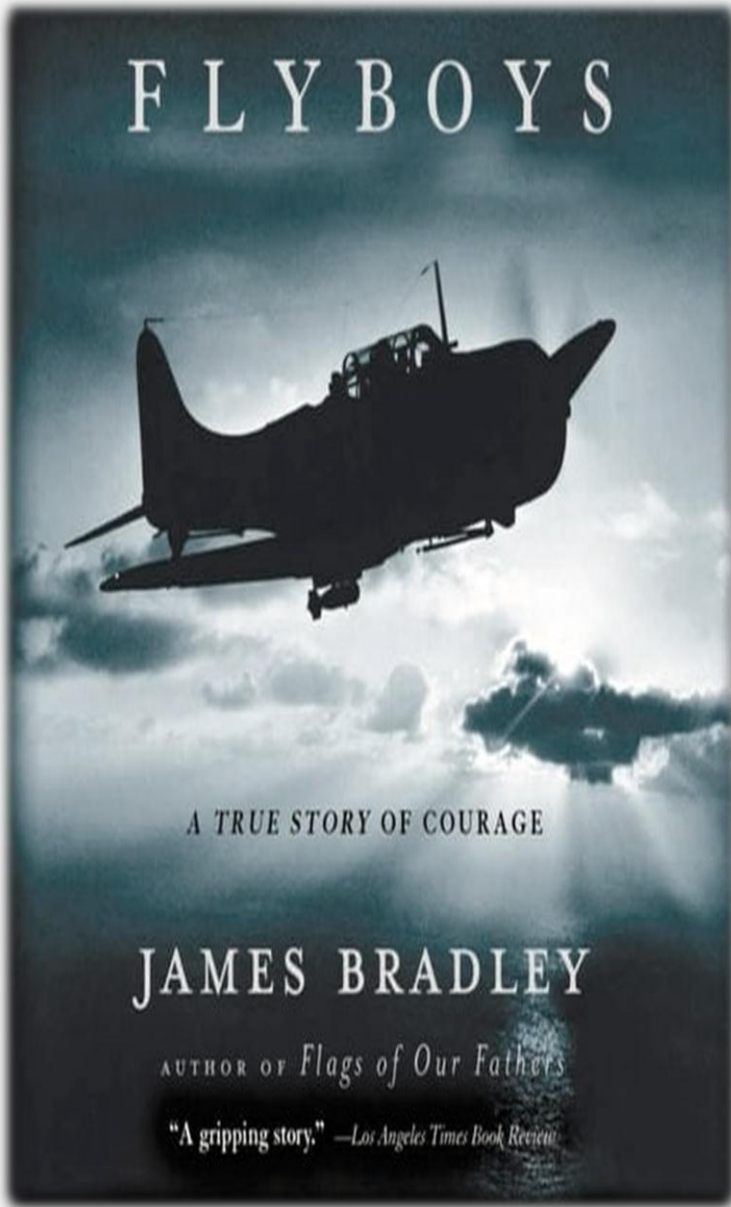
بحری جہازوں سے اپنے جدید جنگی طیاروں کے سکوارڈنز کو شیشی جیما پر بمباری کے لیے بھیجنے کا آغاز کر دیا۔۔۔ لیکن زبردست جاپانی مزاحمت نے امریکی حملے کا رخ موڑ دیا اور کئی طیاروں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بعد امریکہ نے حملہ چند دن کے لیے ملتوی کر دیا۔ 2 ماہ تک امریکی افواج بار بار شیشی جیما کے ٹاورز کو تباہ کرنے کے لیے فضائی حملے کرتی رہیں مگر ہر مرتبہ انہیں کئی طیاروں اور پائلٹس کا نقصان سہنا پڑ رہا تھا۔ ستمبر 1944 میں امریکی فضائیہ ایسا ہی ایک تازہ حملہ کرنے جا رہی تھی۔ اس حملے میں 15 امریکی Avenger طیارے حصہ لے رہے تھے جنہوں نے امریکی ائیر کرافٹ کیریئر USS San Jacinto سے پرواز کی تھی۔۔۔ ان طیاروں کے پائلٹس میں ایک 20 سالہ پائلٹ "جارج" بھی شامل تھا۔ جو کہ اس وقت امریکہ بحریہ کے سبھی پائلٹس میں سب سے کم عمر تھا۔

حملے کی صبح جارج اپنے ریڈیو آپریٹر ڈیل اور جہاز کے گنر ٹیڈ کے ساتھ جہاز میں سوار ہوا گروپ کے باقی طیاروں سمیت شیشی جیما کی طرف روانہ ہو گیا۔۔۔ جاپانی طیارہ شکن گنز سے بچنے کے لیے وہ سب 8 ہزار فٹ بلندی پے پرواز کر رہے تھے تاکہ وہ انکی حدِ ضرب سے باہر رہیں۔ لیکن۔۔۔ ہدف کے قریب پہنچ کر، بم گرانے کے لیے جارج کو اپنا طیارہ کم بلندی پر لانا ہی تھا۔۔۔ اس نے ایک خطرناک غوطہ لگاتے ہوئے طیارے کو ٹھیک، ایک ریڈیو ٹاور کی طرف بڑھایا اور طیارہ شکن گنز کی گولیوں کی بوچھاڑ میں حتیٰ الامکان طیارے کو ہدف کے نزدیک سے نزدیک لیجانے کی کوشش کرنے لگا، اس دوران طیارہ یکے بعد دیگرے تین چار طیارہ شکن گولیوں کا نشانہ بنا۔۔۔ اپنی آخری حد تک غوطہ لگانے کے بعد جارج نے بم گرا دیے جو کہ پہلی مرتبہ ٹاور کے اتنے نزدیک گرے کہ ٹاور کو اس بمباری سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور وہ آوٹ آف ایکشن ہو گیا۔

لیکن جارج کو اس خطرناک غوطہ زنی کی بھاری قیمت چکانا پڑی تھی، کئی طیارہ شکن گولیوں کا نشانہ بننے کے بعد اب اس کے طیارے میں آگ لگ چکی تھی، وہ کسی بھی لمحے دھماکے سے پھٹ سکتا تھا یا زمین بوس ہو سکتا تھا۔۔ جارج نے طیارے کا رخ فوراً جزیرے سے باہر، سمندر کی طرف موڑ دیا۔۔۔ وہ سمندر میں پہنچ کر ایجیکٹ کرنا چاہتا تھا اور اس بات کو یقینی بنا رہا تھا کہ ایجیکٹ کرنے سے قبل جزیرے سے زیادہ سے زیادہ دور جا چکا ہو۔۔۔۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایسے کسی بھی معاملے میں جاپانی فوج، سمندر میں نزدیک ایجیکٹ کرنے والوں کو جا کر سمندر میں ہی گرفتار کر لیا کرتی تھی۔ اور وہ کسی قیمت پر بھی زندہ، جاپانیوں کے ہتھے نہیں لگنا چاہتا تھا۔ تباہ ہوتا طیارہ اب تیزی سے نیچے کی جانب جاتا جا رہا تھا اور سمندر برد ہونے سے قبل ان تینوں کا ایجکٹ کر جانا ضروری تھا۔ اور پھر جارج نے ایجیکٹ کر دیا، پیراشوٹ کی مدد سے سمندر میں اترنے کے بعد اس نے خود کو پیراشوٹ سے نجات دلائی۔ اس نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر طیارے کا لائف رافٹ سمندر میں تیر رہا ہے جو کہ یقیناً اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے ایجکٹ کرنے سے قبل خود ہی طیارے سے گرا دیا تھا تاکہ کھلے سمندر میں وہ ڈوبنے یا سردی سے ٹھٹھرنے سے بچ جائیں۔ رافٹ پے چڑھنے کے بعد۔ جارج نے ادھر ادھر

دیکھ کر اپنے دیگر دو ساتھیوں کا پتا چلانے کی کوشش کی۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ بد قسمتی سے وہ زندہ نہ بچ پائے تھے۔ جارج کے طیارے کے علاوہ بھی 3 طیاروں کو مار گرایا گیا تھا اور ان کے پائلٹس و عملے کے دیگر افراد بھی پانی میں ایجکیٹ ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں جارج نے دور سمندر میں کچھ بوٹس کو اپنی سمت میں بڑھتے دیکھا۔۔۔۔ اور اسکا دل دہل کر رہ گیا وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ جاپانی ہیں جو سمندر میں گرائے گئے طیاروں کے عملے کو گرفتار کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔

جارج اپنے ہاتھوں کو چپو کی طرح چلا کر پوری قوت سے رافٹ کو دھکیلنے لگا تا کہ رافٹ جتنا ممکن ہو جاپانیوں کی حدِ ضرب سے باہر جاسکے۔ لیکن ہاتھوں سے چلائے جا رہے رافٹ اور موٹر بوٹس کی رفتار کا کیا موازنہ؟ فاصلہ ہر سیکنڈ کے ساتھ تیزی سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن پھر اچانک فضا میں طیاروں کی گرج اور پھر جان پھاڑ دینے والی، گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ یہ تازہ دم امریکی طیارے تھے جو اپنی مشین گنز کی مدد سے جاپانی جنگی کشتیوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔

جلد ہی بچی کھچی جاپانی کشتیاں تیزی سے واپس جزیرے کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ جارج کی جان بچ گئی۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ اسے اس بات کی کوئی تصدیق نہ تھی کہ آیا ان طیاروں پر کسی نے سمندر میں اس کا رافٹ دیکھا بھی تھا یا نہیں۔۔۔ اگر کسی نے اسے نہیں دیکھا تو گویا کوئی اسے بچانے نہیں آئے گا۔ جارج پھر سے ہاتھوں کی مدد سے رافٹ کو دھکیلنے لگا تا کہ جزیرے سے زیادہ سے زیادہ دور جاسکے۔ شام تک اس کے بازو بری طرح سے شل ہو چکے تھے، اس کا جسم درد کرنے لگا تھا اور اس کے اعصاب ٹوٹنے کو تھے۔۔۔۔ لیکن دور دور تک کسی امریکی کشتی کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔ پھر اچانک۔۔۔ اسے اپنے نزدیک پانی میں ہلچل محسوس ہوئی، اس نے دیکھا کہ پانی سے کوئی چیز باہر نکل رہی ہے۔۔۔۔۔ یہ ایک پیری سکوپ تھا۔

اور پھر جب وہ آبدوز سمندر کی سطح پر ابھری تو یہ دیکھ کے جارج پھر سے جی اٹھا کہ وہ ایک امریکی آبدوز تھی۔

جارج کو رافٹ سے آبدوز میں پہنچا دیا گیا۔۔۔۔ اور اس کی جان بچ گئی۔ گویا یہ کہانی ایک خوش کن طریقے سے انجام پذیر ہو گئی۔۔۔۔ لیکن۔ پانی میں کودنے والے باقی پائلٹس و عملے کے دیگر افراد اتنے خوش قسمت نہ تھے۔ ان میں سے 8 امریکیوں کو جاپانیوں نے گرفتار کر لیا اور اپنے ساتھ ان بوٹس پر واپس شیشی جیما لے گئے۔

ان کے نام ولہوف، گریڈی، جیمز، فرائزر، مارویل، فلائیڈ، فلائیڈ اور ارل تھے۔ انہیں لا کر جزیرے میں واقع جنگی قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اتنا بھیانک تھا کہ امریکی حکومت نے یہ راز 2004 تک پوری دنیا سے چھپائے رکھا۔۔۔۔ اپنے قیمتی اور اہم ترین کمیونیکیشن ٹاورز کی تباہی پر جاپانی غصے، نفرت اور انتقام کی آگ میں جل بھن رہے تھے۔۔۔۔ اور ان کا افسر تھا لیفٹیننٹ جنرل Yoshio Tachibana۔ یہ درندہ صفت شخص ایک نفسیاتی مریض تھا اور جو پہلے ہی قیدیوں پر بدترین اور وحشیانہ تشدد کے معاملے میں بدنام تھا۔

اور اس واقعے کے بعد تو اس کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو ایک قیدی کو اس حد تک مارنے پیٹنے کا حکم دیا کہ وہ قریب المرگ ہو جائے۔ اور پھر اس کا سر قلم کرنے کے بعد اسے پکانے کا حکم دیا اور اس کا گوشت خود کھانے کے علاوہ اپنے سپاہیوں کو بھی کھلایا۔

دیگر 3 قیدیوں پر زندہ حالت میں سنگین اندازی کرنے کے بعد انہیں یونہی پکا کر کھایا گیا۔ یہاں تک کہ آخری 4 قیدیوں پر تو اس سے بھی بھیانک ظلم کیا گیا۔۔۔ انہیں زندہ رکھ کر ان کے اعضاء کو کاٹ کر پکالیا جاتا تھا اور کاٹ کر بیں ڈ تیج کر دی جاتی تھی تا کہ خون بہنے سے وہ نہ مر جائیں۔ یہاں تک کہ آخری حد تک زندہ حالت میں رکھ کر ایسا سلوک کرنے کے بعد ہی انہیں ختم کیا جاتا تھا۔ یہ سب درندگی اور آدمخوری ایک ماہ سے بھی زیادہ عرصہ جاری رہی۔۔۔ ہر سپاہی کا قتل، پکوائی اور اسے کھانے کا کام اس کے دیگر زندہ ساتھیوں کی نظروں کے سامنے کیا جاتا تھا۔ جنگ جیتنے کے بعد جب امریکیوں کو اس بھیانک واقعے کا علم ہوا اور انہوں نے شیشی جیما میں گرفتار جاپانیوں کی نشاندہی پر کھدائی کر کے اپنے ساتھیوں کی ہڈیاں برآمد کیں تو ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ حکومت نے سختی سے اس خبر کو چھپائے رکھنے کے احکامات دیے اور 2004 سے قبل یہ سانحہ دنیا کی نظروں سے اوجھل رہا۔

انجام کار:

جنرل Yoshio Tachibana اور اس کے سبھی ساتھیوں کو اس درندگی اور دیگر جنگی جرائم کے عوض 24 ستمبر 1947 کو گوام میں تختہ دار پے لٹکا دیا گیا۔ اور اس سانحہ میں زندہ بچنے والا واحد خوش قسمت پائلٹ " جارج ایچ۔ ڈبلیو بش " آگے چل کر امریکہ کا 41 واں صدر بن گیا۔

بحوالہ کتاب: Flyboys: A True Story of Courage

از۔ James Bradley

خونی (حصہ اول)

12 ستمبر 1982, الاسکا کے دور دراز اور دشوار جنگلی خطے میں دو پولیس آفیسرز اپنی چھٹی کے دوران شکار میں مگن تھے۔ یہ علاقہ قریب ترین قصبے Anchorage سے تقریباً 80 کلومیٹر دور ہے اور اس کی دشوار گزاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں تک کوئی زمینی رسائی نہ تھی بلکہ محض بوٹ یا پھر سیسنا طرز کے چھوٹے طیاروں پر ہی یہاں پہنچا جاسکتا تھا جس کے لیے یہاں ایک ائیر سٹرپ قائم تھی۔۔۔ یہ علاقہ شکاریوں کے لیے پسندیدہ ترین مقام تھا۔

شکار کی تلاش میں گھومتے وقت اچانک ایک افسر کی نظر زمین سے جھانک رہے ایک بُوٹ پر پڑی۔۔۔ وہ دونوں اس مقام تک پہنچے۔ اور بوٹ کا جائزہ لینے پر ان پہ انکشاف ہوا کہ یہ بوٹ ایک لاش کے پیر کا تھا جو اس وقت پوری طرح سے مٹی میں دبی تھی۔

انہوں نے اس مقام کو نقشے پہ مارک کیا اور واپس چلے گئے۔۔۔ واپس جاکر انہوں نے اپنے محکمے کو اس ممکنہ کرائم سین سے آگاہ کیا ۔ اور اگلے روز الاسکا پولیس کی تکنیکی ٹیم اس مقام پر پہنچ گئی۔۔۔ انہوں نے اپنے مخصوص اوزاروں اور پیشہ ورانہ مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس لاش کو زمین سے نکالا جو کہ اب تک تقریباً ڈھانچہ ہی بن چکی تھی۔

اس کے جسم پر زنانہ لباس تھا۔۔۔ گویا وہ لاش کسی خاتون کی تھی۔۔ لاش کو زمین سے نکال کر باڈی بیگ میں محفوظ کر لینے کے بعد انہوں نے میٹل ڈیٹیکٹر کی مدد سے، اس کھدی ہوئی مٹی اور اس پاس کے مقام کا معائنہ کیا اور انہیں ایک عدد 223 کلیبیر گولی کا خول ملا، جو کہ شکاری رائفلز کے استعمال کی جاتی ہے۔

لاش کو واپس پہنچانے کے بعد لیب میں منتقل کر دیا گیا اور اس کا تفصیلی معائنہ (Autopsy) کیے جانے پر یہ انکشافات ہوئے کہ اس خاتون کو مرے ہوئے 6 ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔۔۔ اس کو تین مرتبہ گولی ماری گئی۔۔۔ اس کے لباس پر گولیوں کے کوئی سوراخ نہ تھے یعنی قتل کے وقت وہ بے لباس تھی اور قتل کے بعد اسے لباس پہنایا گیا۔۔۔ اس کے لباس کے ساتھ کپڑے کی ایک پٹی بھی ملی جو اس کے لباس کا حصہ نہ تھی، یعنی ممکنہ طور پر اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کے شوٹ کیا گیا تھا۔۔۔ اس کے دانتوں کا معائنہ کرنے کے بعد ایکسرے اور دیگر تفصیلات کو ڈینٹل ریکارڈ کے شعبے میں بھیج دیا گیا اور چند دن بعد انہوں نے یہ جواب ارسال کیا کہ یہ لاش 23 سالہ خاتون "شیری مورو" کی ہے جس کا تعلق اینکریج سے ہے۔ الاسکا پولیس کے پاس 6 ماہ قبل شیری کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی گئی تھی لیکن پولیس اب تک اسے ڈھونڈ نہ سکی تھی یہاں تک کہ اس کی لاش برآمد ہوگئی۔۔۔ پولیس کے پاس واحد کلیو شیری کی ایک سہیلی کا بیان تھا جس میں اس نے پولیس کو بتایا کہ "آخری ملاقات میں شیری نے بتایا کہ وہ ایک پروفیشنل فوٹوگرافر

سے ملنے جا رہی ہے جس نے اس کی تصاویر کے عوض اسے 300 ڈالرز کی آفر کی ہے۔"

لیکن پولیس کے پاس اس نامعلوم فوٹو گرافر کا نام، پتہ، حلیہ یا کوئی بھی اشارہ موجود نہ تھا چنانچہ پولیس اس فوٹو گرافر کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو پائی۔

لیکن اب۔۔۔ جبکہ یہ کنفرم ہو چکا تھا کہ گمشدہ شیری کا انتہائی بیدردی سے مرڈر کر دیا گیا ہے۔

تو پولیس نے یہ تفصیلات میڈیا سے شیئر کیں تا کہ ٹیلی ویژن پر اس کیس کے بارے میں دیکھ سن کر شاید کوئی شخص پولیس کو ایسا کلیو فراہم کر پائے کہ پولیس اس مدعے پر مکمل اندھیرے سے باہر آ جائے۔

پولیس کی پریس کانفرنس کے دوران ایک رپورٹر نے سوال کیا" کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ مرڈر کیس، الاسکا کے اسی علاقے میں پہلے ہو چکے قتل کے کیسز کا شاخسانہ ہے ؟". رپورٹر کا یہ سوال انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ۔۔۔۔۔ اس سے قبل دو سال کے عرصے میں اسی شکار گاہ سے 2 مزید نوجوان لڑکیوں کی لاشیں بھی اسی طرح بر آمد ہو چکی تھیں اور ان کے قاتل یا قاتلوں کا بھی کوئی سراغ نہ مل پایا تھا۔ اب پولیس سنجیدگی سے اس بات کے امکانات پے غور کر رہی تھی کہ کہیں ان تینوں خواتین کا قاتل ایک ہی تو نہیں۔۔۔؟ کہیں اس علاقے میں کوئی "سیریل کلر" تو نہیں دندناتا پھر رہا۔۔۔؟

کیونکہ۔۔۔۔ گزشتہ چند سال سے اینکر تیج سے گمشدگی کی متعدد رپورٹس درج کروائی گئیں تھیں اور ہر رپورٹ کسی نوجوان لڑکی کی گمشدگی کی ہی تھی۔ لیکن فی الوقت کسی کے پاس اس سوالوں کا کوئی جواب موجود نہ تھا۔

اور اسی طرح کئی ماہ بیت گئے۔ 13 جون 1983 کو در پیش آنے والے ایک واقعے نے پولیس کی توجہ پھر سے اپنی جانب مبذول کی۔۔ اس صبح ایک شخص اپنی گاڑی پر اینکر تیج کی ایک کم استعمال شاہراہ سے گزر رہا تھا کہ اچانک قریب، جنگل سے ایک لڑکی، چیختی ہوئی سڑک پر پہنچی اور اس نے اس کی گاڑی کے سامنے آکر بے چینی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اس لڑکی کے پیروں میں کوئی جوتے نہ تھے اور اس کی پینٹ بھی غائب تھی اور اس نے محض ایک انڈرویئر پہن رکھا تھا۔ اس کی بائیں کلائی میں ایک ہتھکڑی بندھی تھی۔ پہلی نظر میں ہی ڈرائیور سمجھ گیا کہ وہ لڑکی کسی مشکل کا شکار ہے۔۔۔ اس نے گاڑی روکی اور لڑکی بھاگتے ہوئے گاڑی تک پہنچنے کے بعد پچھلی سیٹ پے سوار ہو کر گاڑی میں اس طرح جھک کر بیٹھ گئی جیسے وہ خود کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ڈرائیور نے اس سے کوئی بات کیے بنا گاڑی آگے بڑھا دی کہ ممکن ہے کوئی مجرم اس لڑکی کے تعاقب میں ہو اور وہ مسلح بھی ہو سکتا تھا۔۔۔

گاڑی کو کچھ فاصلے تک ڈرائیو کرنے کے بعد اس نے سہمی ہوئی، بری طرح سے ہانپ رہی اس لڑکی سے پوچھا کہ اسے کہاں اتارا جائے؟ تو اس نے ڈرائیور کو ایک نزدیکی ہوٹل کا ایڈریس بتایا۔ ڈرائیور نے بلا تاخیر گاڑی کو بتائے گئے ہوٹل کی طرف موڑ دیا۔ جب اس

ہوٹل کے سامنے گاڑی رکی تو وہ لڑکی گاڑی سے اتر کر اسی طرح بھاگتی ہوئی ہوٹل میں داخل ہوئی اور وہاں موجود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔۔۔۔

استقبالیہ پر تعینات عملے نے جب اس نیم عریاں لڑکی کو ہتھکڑی سمیت یوں بھاگ کر کمرے میں گھستے دیکھا تو انہوں نے ہتھکڑی کی وجہ سے پولیس کو یہ سوچ کر اطلاع کر دی کہ کہیں یہ لڑکی پولیس کی حراست سے تو نہیں بھاگ کے آئی!

تھوڑی دیر میں پولیس اہلکار ہوٹل پہنچ گئے، انہوں نے مذکورہ کمرے کا درواز ہدروازہ کھٹکھٹایا اور اسی سہمی ہوئی لڑکی نے دروازہ کھولا۔۔۔۔پولیس کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور اس نے پولیس اہلکاروں کو اندر بلایا۔پتا چلا کہ اس کا نام Cindy Paulson ہے۔ عمر 17 سال اور اس کا تعلق بھی اینکرج سے ہے۔ جب پولیس اہلکاروں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ مفرور نہیں ہے بلکہ اس کی ہتھکڑی کسی حملہ اور شخص کی طرف سے لگائی گئی ہے، تو پولیس نے اس کے ہتھکڑی کھول دی۔۔۔

ابتدائی تفتیش پر جب پولیس نے اس سے پوچھا کہ وہ اس حالت تک کیسے پہنچی اور اس پر کیا کچھ بیت چکا ہے ؟ تو اس نے جو تفصیلات بتائیں وہ انتہائی دلخراش تھیں۔ سِنڈی کی کہانی کچھ یوں تھی:

" میں ایک پیشہ ور جسم فروش ہوں۔ گزشتہ رات میں اینکریج کی ایک سڑک پر کسٹمرز کے انتظار میں تھی کہ ایک گاڑی میرے قریب آکر رکی۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بے ضرر سا نظر آنے والا شخص موجود تھا۔۔۔اس نے مجھ سے میری سروسز طلب کیں۔ وہ میرے ساتھ آنے کے بجائے مجھے اپنے ساتھ اس کی رہائش گاہ پر لیجانا چاہتا تھا اور میں نے اس کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا۔ گاڑی پر اس کے ساتھ بیٹھنے کے بعد ہم کچھ فاصلے تک ہی چلے ہوں گے کہ اس نے اچانک ایک پسٹل اور ایک ہتھکڑی نکالتے ہوئے گن پوائنٹ پر ہتھکڑی کو میری کلائی میں ڈال دیا اور مجھے دھمکی دی کہ کوئی بھی غیر ضروری حرکت مجھے موت کے منہ میں پہنچا دے گی۔۔۔۔کافی دیر تک ڈرائیونگ کے بعد وہ ایک گھر تک پہنچا اس نے کار پارک کی اور مجھے لے کر اپنی رہائش گاہ میں پہنچا اور پھر گھر کے تہہ خانے میں لے گیا جہاں چھت سے ایک بہت لمبی زنجیر لٹک رہی تھی۔ اس نے گن پوائنٹ پر مجھے زنجیر کے ساتھ باندھ دیا۔۔۔ جس کے بعد اس نے کئی گھنٹے تک مجھے تشدد کا نشانہ بنایا۔

اور پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ سونے جا رہا ہے اور اگر میں نے چیخنے چلانے یا فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ مجھے شوٹ کر دے گا۔۔۔۔

چند گھنٹوں بعد وہ شخص واپس آیا اور اس نے مجھے زنجیر سے آزاد کیا پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر کے مرکزی کمرے تک پہنچا جہاں دیواروں کے ساتھ شکار شدہ بے شمار جانوروں کے سر آرائشی طرز پے لگے ہوئے تھے۔۔۔اس نے فخریہ انداز میں مجھے یہ سب دکھایا اور اپنی شکاری مہارت کے قصے سناتا رہا(یقیناً وہ نفسیاتی مریضوں کی اس صنف میں سے تھا کہ جن کو اپنی دولت یا کامیابی کی نمائش کی عادت نشے کی حد تک ہوتی ہے)۔ اب مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ مجھے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑے گا۔ کیونکہ میں اس کا

نام، چہرہ، گھر اور وہ سب تفصیلات جان چکی تھی کہ جس بنا پر کسی بھی مجرم کو فوراً دبوچا جا سکتا ہے۔ صبح کے قریب اس نے مجھے گن پوائنٹ پر پھر کار تک پہنچایا۔ (مجرم نے اسے جان بوجھ کر نیم عریاں حالت میں رکھا تا کہ وہ اس حالت میں فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکے)۔

کچھ وقت کی ڈرائیونگ کے بعد کار ایک قریبی ائیر فیلڈ تک پہنچی۔۔۔ اس نے ایک کار کو ایک ہینگر کے نزدیک پارک کیا جس میں ایک ٹوسیٹر طیارہ موجود تھا۔ اس نے مجھے گن پوائنٹ پر طیارے تک پہنچا کر اس میں سوار کیا اور پھر کار سے بیگوں میں بند کچھ سامان اتار کر طیارے میں منتقل کرنے لگا۔ (یاد رہے کہ امریکہ، کینیڈا میں ذاتی طیارہ خریدنا، رکھنا اور اڑانا قانونی ہے اور پرائیویٹ طیاروں کے لیے کئی چھوٹی بڑی پرائیویٹ ائیر فیلڈز بھی موجود ہیں جہاں طیارہ پارک کرنے، ٹیک آف لینڈ کرنے کے لیے اس کے مالک کو ائیر فیلڈ کو ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔)

میرے پاس یہی چند سیکنڈز تھے کہ جب وہ سامان لینے کے لیے طیارے سے کار کی طرف بڑھا تو میں نے باہر چھلانگ لگا دی اور بے تحاشا ایک طرف دوڑ پڑی۔۔۔ مجرم چیختا اور دھمکیاں دیتا میرے پیچھے دوڑنے لگا۔۔۔ میں اپنے وجود کی پوری طاقت سے بھاگ رہی تھی یہاں تک کہ میں مجرم اور خود میں اتنا فاصلہ بنا لینے میں کامیاب ہو گئی کہ ہائی وے پر پہنچنے کے بعد میں ایک گاڑی کو روک کر اس میں سوار ہو پائی۔ (یقیناً اس وقت مجرم کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا ورنہ وہ بلا دریغ اسے شوٹ کر دیتا۔۔۔ ساتھ ہی یقیناً صبح منہ اندھیرے اس وقت ائیر فیلڈ پر نزدیک کوئی اور شخص موجود نہ تھا ورنہ وہ شاید اس معاملے میں کوئی مداخلت کرتا یا کم از کم پولیس کو رپورٹ کر دیتا۔)

سنڈی نے پولیس کو مجرم کا نام اور گھر کی سب تفصیلات سے آگاہ کر دیا

سِنڈی کی بتائی کہانی اس قدر وحشت آمیز تھی کہ پولیس نے بلا تاخیر اس کیس کو فالو کرتے ہوئے سنڈی کو پولیس وین میں ان کے ساتھ چل کر وہ ائیر فیلڈ دکھانے کا مطالبہ کیا جہاں سے وہ فرار ہو کر آئی تھی۔ مطلوبہ ائیر فیلڈ پر پہنچنے کے بعد سنڈی نے اس ہینگر تک پولیس کی راہنمائی کی کہ جہاں سے وہ فرار ہوئی تھی۔۔۔۔ طیارہ ابھی تک ہینگر میں موجود تھا۔ پولیس نے طیارے کے ٹیگ نمبر اور دیگر تفصیلات کا اندراج کیا۔ وہ طیارہ Robert Hansen کے نام سے رجسٹرڈ تھا جس کی رہائش گاہ ائیر فیلڈ سے زیادہ دور نہ تھی۔

اگلے روز پولیس اہلکار اس کے گھر کا سرچ وارنٹ حاصل کرنے کے بعد مطلوبہ پتے پر پہنچے اور رابرٹ سے ملاقات کی۔

غیر متوقع طور پر رابرٹ پولیس سے مکمل تعاون کرنے پر رضامند تھا۔۔۔ پولیس نے اس کے گھر کی تفصیلی تلاشی لی، لیکن انہیں وہاں ایسے کوئی آثار نہ ملے کہ یہاں کسی مغوی کو حراست میں رکھا گیا ہو۔ (شاید اس نے زنجیر ہٹا کر غائب کر دی تھی)۔۔۔ دورانِ تلاشی پولیس کو اس کے گھر سے کوئی مشکوک چیز نہ ملی۔

پولیس نے اس سے استفسار کیا کہ گزشتہ رات وہ کہاں تھا؟ تو اس نے جواب دیا کہ پچھلی رات میں اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ تھا ۔پولیس نے ان دوستوں کے نام، ایڈریس اور کانٹیکٹ نمبرز نوٹ لیے اور فرداً فرداً سبھی سے تفتیش کی۔۔۔۔ سبھی دوستوں نے

رابرٹ کی تصدیق کی کہ واقعی وہ گزشتہ رات ان کے ساتھ تھا۔۔۔۔اس سب سے فراغت پا کر پولیس نے پھر سے سِنڈی سے رابطہ کیا اور اس کے سامنے اپنی تحقیقات کے نتائج رکھے۔۔۔۔ اور اس سے پوچھا کہ اس نے پولیس کو جو کہانی سنائی ہے۔۔۔وہ کسی پہلو سے بھی مصدقہ نہیں لگ رہی۔

لیکن سنڈی اسی بات پر بضد رہی کہ اس نے جو کچھ کہا وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ جس پر پولیس نے کہا "پھر ہم تمہارا پولی گراف ٹیسٹ لینا چاہیں گے ."لیکن۔سنڈی نے پولی گراف ٹیسٹ سے انکار کر دیا!اور پولیس نے رابرٹ کو بے گناہ قرار دیتے ہوئے کیس کو بند کر دیا۔ایک لاش سے شروع ہونے والا کیس کیسے 100 لاشوں تک پہنچا۔۔۔۔ جانیے اگلے حصے میں۔

خونی حصہ دوئم

2 ستمبر 1993 کو اینکر یج کے نزدیکی جنگل میں کچھ کنسٹرکشن کے سلسلے میں زمین کی کھدائی کی جارہی تھی اور اس دوران کنسٹرکشن ورکرز کو کھدی ہوئی مٹی میں کچھ انسانی باقیات نظر آئیں۔۔۔کام فوراً روک دیا گیا اور انہوں نے پولیس کو اطلاع کردی۔۔۔کچھ ہی دیر میں پولیس اہلکار موقع پر پہنچ گئے۔"شیری مورو" کیس کی طرح اب کی مرتبہ بھی جائے واردات سے 223 کیلیبر شکاری رائفل کی گولی کا خول برآمد ہوا۔ہڈیوں کو تفصیلی معائنہ کے لیے لیب بھجوادیا گیا۔۔۔اٹاپسی رپورٹس آنے پر انکشاف ہوا کہ مقتول ایک خاتون ہے اور موت کی وجہ گولی لگنا ہے۔۔۔ایک آدھ دن میں ڈینٹل ریکارڈز کے شعبے نے بھی جواب بھجوادیا جن

کے مطابق مذکورہ کھوپڑی 17 سالہ خاتون Paula Goulding کی ہے جو کہ ایک مقامی کلب میں رقاصہ تھی۔اب پولیس کو کنفرم ہوچکا تھا کہ اب کی بار ان کا سامنا ایک مکار سیریل کلر سے ہے۔۔۔۔۔ساتھ ہی انہوں نے رابرٹ ہینسن کو پھر سے شک کے دائرے میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اب بھی انکریج پولیس کے کئی اہلکار اسے سنڈی پالسن اغواء کیس میں مجرم سمجھتے تھے لیکن عدم ثبوت کی بناپر اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکا تھا۔۔۔

لیکن۔۔۔اب کیس FBI کو ریفر کیا جاچکا تھا۔چنانچہ پولیس کے بجائے اب FBI نے رابرٹ کے گھر چھاپہ مارا اور تلاشی کے ماہر خصوصی اہلکاروں کی مدد سے اس کے گھر کی تفصیلی تلاشی لی گئی۔انہوں نے اس کے گھر سے ایک نقشہ برآمد کیا جس پر 37 مقامات کو مارک کیا گیا تھا۔

انہوں نے وہاں سے ایک 223 کلیبر شکاری رائفل اور ایک بیگ بھی برآمد کیا جو جیولری سے بھرا ہوا تھا۔۔۔اور اسی جیولری میں سے ایک ایسا نیکلس برآمد ہوا جو کہ بعد میں شیری مورو کی ملکیت ثابت ہوا۔۔۔

جس وقت FBI کی ٹیم رابرٹ کے گھر سے بر آمد ہونے والا مشکوک سامان اپنی گاڑیوں میں منتقل کرنے میں مصروف تھی اسی دوران ایک پڑوسی خاتون نے انہیں اپروچ کیا اور اس نے بتایا کہ "میرا خاوند رابرٹ کا دوست ہے اور رابرٹ نے کچھ عرصہ قبل اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے ایک پولیس کیس میں Alibi (یعنی جرم کے وقت کسی شخص کے کسی اور مقام پر ہونے کی تصدیق) فراہم کرے۔FBI جانتی تھی کہ پولیس کا رابرٹ کو گرفتار نہ کرنے کی واحد وجہ جرم کی رات اس کے دوستوں کے ساتھ موجود ہونے کی تصدیق تھی۔۔۔ لیکن اب ان پر یہ نیا انکشاف ہوا تھا کہ وہ Alibi جعلی تھی۔۔۔FBI نے یکے بعد دیگرے اس کے ان سب ساتھیوں سے رابطہ کر کے انہیں تنبیہ کی کہ ان کی طرف سے پیش کی گئی جعلی Alibi غلط ثابت ہو چکی ہے لہٰذا وہ اس سے منحرف ہو جائیں بصورت دیگر معاونتِ جرم کے سلسلے میں انہیں بھی اس مقدمے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔اب کی بار جب رابرٹ گرفتار کیا گیا تو قانون نافذ کرنے والے اداروں کے پاس اس کے جرائم کے ٹھوس ثبوت موجود تھے۔۔۔

ابتدائی تفتیش میں ہی رابرٹ نے ان 4 لڑکیوں کے قتل کا اعتراف کر لیا کہ جن کی باقیات اب تک بر آمد ہو چکی تھیں۔۔۔ لیکن اس نے مزید کسی بھی قتل کے اعتراف سے یکسر انکار کر دیا۔

پولیس نے اسے پیشکش کی کہ " اگر وہ اپنے سبھی وکٹمز کی تفصیلات اور جائے تدفین سے انہیں آگاہ کر دے تو اس پر صرف انہیں 4 قتل کے مقدمات میں مقدمہ چلایا جائے گا اور دیگر وارداتوں کو اس مقدمے میں نہیں شامل کیا جائے گا۔"رابرٹ نے پولیس کی یہ پیشکش مان لی۔۔۔۔

اور اس نے اپنے طریقہ واردات کی جو تفصیلات پولیس کے سامنے رکھیں اس نے پولیس افسران کو بھی لرزا کے رکھ دیا۔اس نے بتایا کہ وہ رات کے وقت اینکرج میں اپنی کار ڈرائیو کرتا ہوا کسی جسم فروش لڑکی، رقاصہ یا کلب ورکر کو بھاری رقم کے عوض کچھ آفرز کر کے اپنی کار میں آنے پر آمادہ کرتا تھا اور اس کے بعد انہی گن پوائنٹ پر ہتھکڑی لگا دیتا تھا۔ اپنی رہائش گاہ پر لیجانے کے بعد وہ انہیں اپنے گھر کے تہہ خانے میں زنجیر سے باندھ دیا کرتا تھا اور کئی گھنٹوں تک ٹارچر کرتا تھا۔اس تشدد سے جی بھر جانے کے بعد وہ اذیت پسندی کے اس کھیل کا دوسرا مرحلہ شروع کرتا تھا۔۔۔وہ بری حالت اور اعصابی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ان لڑکیوں کو گن پوائنٹ پر پھر سے کار میں بٹھا کر اسی ایئر فیلڈ میں اپنے طیارے تک لیجاتا تھا اور پھر طیارے کے زریعے انہیں اسی گھنے جنگل میں قائم شکار گاہ تک لے جاتا تھا جہاں سے پہلی 3 لاشیں بر آمد ہوئی تھیں۔۔۔اس جنگل میں اس کا ایک چوبی کیبن تھا اور رابرٹ مغوی لڑکیوں کو اپنے ساتھ وہاں لیجاتا تھا جہاں دور دور تک اور کوئی انسان نہ ہوتا تھا۔۔۔یہاں آکر وہ اپنی شکاری رائفل اور خنجر سنبھالتا ۔۔۔۔اور پھر مغوی لڑکی کی آنکھوں پر مظبوطی سے کپڑے کی پٹی باندھ کر اسے دیکھنے سے قاصر کر دیتا تھا۔۔۔مغویہ کے ہاتھ وہ پشت پے کر کے ہتھکڑی سے باندھ دیتا تھا۔۔۔اور پھر اسے لباس سے مکمل محروم کر دینے کے بعد اسے بھاگ جانے کو کہتا۔

بدترین حالات کا شکار لڑکی نظر نہ آنے کے باوجود محض کسی بھی طرح اپنی جان بچانے کی نیت سے جب اس گھنے ترین، خطرناک جنگل میں ننگے پیر بھاگتی تو وہ ہر چند قدم پر درختوں، پتھروں، کانٹوں، جھاڑیوں سے الجھ کر گرتی، پھر اٹھتی، پھر بھاگتی اور چند قدم بعد پھر کسی چیز سے ٹکرا کے گر جاتی۔۔۔اس کے پیر جنگل کے کانٹوں اور کنکروں پتھروں سے چھیدے جاتے اور اس کا بے لباس جسم کانٹوں، پتھروں، درختوں سے رگڑ کھاتا ہوا سر تا پا لہو لہان ہو جاتا اور رابرٹ کسی شکاری کی طرح اپنی بندوق اور خنجر لیے اس کا تعاقب کرتا رہتا۔۔۔

ریچھوں اور خطرناک جانوروں سے بھرے جنگل میں گرتی پڑتی وہ لڑکی اگر کسی درندے کا شکار ہو جاتی یا کسی کھائی میں گر کے مر جاتی تو یہ اس کے لیے سب سے بڑی خوش قسمتی ہوتی کیونکہ کئی گھنٹوں سے اس کے تعاقب میں آ رہا رابرٹ جب اسے پا لیتا تو اس کھیل کا آخری فیز شروع کر دیتا تھا۔۔۔وہ اپنے خنجر سے اس لڑکی کو جان بوجھ کر زخمی کر دیتا تھا اور اس کے بعد جب وہ بھاگتی تو اس کے زخم سے رواں خون کی لکیر رابرٹ کو راستہ دکھاتی جاتی تھی۔

ایک وقت کے بعد مغویہ تھکاوٹ، درد اور زیادہ خون بہہ جانے کے باعث گر جاتی اور پھر اٹھنے سے قاصر رہتی، تو جب رابرٹ اب کی بار اسے پاتا تو اسے قریب سے گولی مار کے ختم کر دیتا۔۔۔جس کے بعد وہ نزدیک ہی گڑھا کھود کے اس کے جسد کو دفن کر دیا کرتا تھا۔

رابرٹ نے پولیس کے سامنے 37 لڑکیوں کو اسی طرز پے قتل اور دفن کرنے کا اعتراف کیا۔ جبکہ پولیس رابرٹ کی مدد سے محض 8 قبروں کا ہی سراغ لگا پائی کیونکہ دیگر اکثریت قبروں کا مقام رابرٹ یاد رکھ نہ پایا تھا۔

لیکن۔۔۔میڈیا کا ماننا تھا کہ 37 کا ہندسہ محض ایک جھوٹ ہے۔ رابرٹ کے اصل وکٹمز کی تعداد 100 کے نزدیک ہو سکتی ہے۔اسی برس رابرٹ کو اس کے بھیانک جرائم کے عوض عدالت نے 461 برس قید کی سزا سنادی۔۔۔

21 اگست 2014 کو رابرٹ اپنی باقی زندگی قید میں گزادینے کے بعد جیل میں ہی بیماری کے باعث انتقال کر گیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر 75 برس تھی۔رابرٹ ہینسن کیس کے بارے میں مزید جاننے کے لیے آپ Robert Hensen Serial Killer لکھ کر یوٹیوب یا وکیپیڈیا پہ سرچ کر سکتے ہیں!

گمشدہ

1970 کی دہائی میں برازیل کے شہر Rio میں مقیم المیڈا فیملی نے ایک کچھوی پال رکھی تھی جو کہ red-footed tortoise نسل کی تھی۔۔۔اس کا نام انہوں نے "منولا" رکھا ہوا تھا۔

1982 میں اچانک ایک دن منولا لاپتہ ہوگئی۔گھر کے سبھی افراد نے اسے گھر کے کونے کونے میں کئی دفعہ تلاش کیا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ مل پایا۔۔کئی روز کی تلاش کے بعد انہوں نے سوچا کہ شاید غلطی سے گھر کا مرکزی دروازہ کھلا رہ جانے کے باعث منولا باہر نکل گئی ہوگی پھر یا تو کوئی اسے اٹھا کر لے گیا ہوگا یا پھر وہ خود ہی گھر سے بھاگ گئی ہوگئی۔اس طرح انہوں نے منولا کی تلاش روک دی۔2013 میں المیڈا فیملی کے افراد گھر کی سیٹنگ کی نیت سے پرانا بے کار سامان اور کاٹھ کباڑ نکال کر گھر سے باہر پھینکنے میں مصروف تھے کہ ایک پڑوسی نے ان سے کہا" آپ کچھوا بھی پھینکنا چاہتے ہیں؟" جس پر انہیں حیرت کا جھٹکا لگا۔۔۔"کونسا کچھوا؟؟" انہوں نے پوچھا۔جس پر پڑوسی نے انہیں، ان کے باہر پھینکے جارہے سامان میں موجود ایک پرانا ڈبہ دکھایا۔۔۔اور یہ دیکھ کر ان کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا کہ اس ڈبے میں ان کی 30 برس قبل لاپتہ ہوئی کچھوی "منولا" موجود تھی۔یہ ڈبہ اور اس کے ساتھ کا دیگر سامان انہوں نے ایک پرانے، متروک سٹور روم سے نکالا تھا۔۔۔یعنی منولا 30 برس سے اس بند سٹور روم میں رہی تھی ؟ عملاً یہ ناممکن تھا۔کچھوے بھلے ہی طویل عرصہ لگائے پیے بغیر رہ سکتے ہیں لیکن یہ عرصہ زیادہ سے زیادہ 3 برس ہو سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں۔30 سال تو منولا کی استطاعت سے 10 گنا زیادہ عرصہ تھا۔پھر آخر منولا 3 دہائیاں بغیر کھائے پیے ایک بند کمرے میں کیسے رہی؟اس سلسلے میں برازیل کے ایک زوالوجسٹ،Dr Peres نے اس سٹور روم کا معائنہ کیا کہ جہاں سے منولا برآمد ہوئی تھی تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ اس بوسیدہ کمرے میں بارشوں سے دیوار، چھت ٹپکتی ہیں اور بارشوں کے علاوہ بھی دیوار سے نمی خارج ہوتی ہے۔یعنی منولا کے لیے پانی کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا، وہ دیواروں سے رسنے والی نمی اور بارش کا پانی چاٹ کر گزارہ کر سکتی تھی۔

لیکن اہم سوال یہ تھا کہ اس عرصے کے دوران اس نے خوراک کہاں سے حاصل کی ہوگی؟ تو ڈاکٹر پیرس نے کہا کہ منولا اتنے عرصے دیمک، چیونٹیاں اور دیگر کیڑے مکوڑے کھا کر گزارہ کرتی رہی۔منولا صحت مند تھی اور ابھی بھی اس کی اوسط عمر کے 20 سال باقی ہیں۔امید ہے اب کی بار المیڈا فیملی اس کا ٹھیک سے خیال رکھے گی!

خون آلود دلدل

کسی بھی جنگ کے دوران انسان کو دو ہی سب سے بڑے خطرات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔۔۔ دشمن۔۔۔اور قدرتی آفات جیسے ناساز گار موسم۔

لیکن۔ 1945 میں برما کے محاذ پر اتحادی اور جاپانی افواج کے درمیان لڑا جانے والا "معرکہِ جزیرہ رامری "Battle of Ramre Island ایک ایسی خونریز جنگ تھی کہ جس میں جاپانی فوج کو ایک ایسے دشمن سے سامنا کرنا پڑ گیا کہ جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو گا!!

پسِ منظر:

دسمبر 1941 میں جاپان نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران برما پر حملہ کر دیا,اس محاذ پر 1 لاکھ برمی اور تقریباً 50 ہزار برطانوی فوج جاپانیوں کے مقابلے میں صف آراء تھیں۔۔۔ لیکن جدید ہتھیاروں، زبردست فضائی طاقت اور دنیا کی سب سے بڑی بحریہ کے حامل جاپان نے مئی 1942 تک چلنے والے اس معرکے میں بہت برے طریقے سے اتحادیوں کو شکست سے دوچار کر دیا۔۔۔ اس جنگ میں 40 ہزار برمی اور 30 ہزار برطانوی فوجی مارے گئے جبکہ جاپان کا جانی نقصان صرف 5 ہزار تک محدود رہا۔ جاپانی فوج نے 111 اتحادی طیارے اور 100 ٹینکوں کو بھی تباہ کر دیا۔۔۔۔ اب برما پر جاپان کا قبضہ تھا۔

پانسہ پلٹتا ہے:

نومبر 1944 کو اتحادی افواج نے جاپان سے برما کی بازیابی کے لیے ایک منظم اور خونریز جوابی مہم کا آغاز کر دیا۔ شروع میں یہ کارروائی برما میں متمکن جاپانی افواج پر شدید نوعیت کی فضائی بمباری اور بحری کارروائیوں تک محدود رہی۔

پھر جنوری 1945 میں اتحادیوں نے برما کے مضافاتی جزائر کو جاپانیوں سے آزاد کروانے کی مہم کا آغاز کر دیا تا کہ ان جزائر کو میں لینڈ برما پر بمباری اور حملوں کے لیے بطور ائیر فیلڈز، سپلائی روٹس اور ہیڈ کوارٹرز استعمال کیا جا سکے۔

معرکہِ رامری:

جزیرہِ رامری برما کی ریاست رخاین کے نزدیک 520 مربع میل پر مشتمل ایک جزیرہ ہے جس پر 1941 سے جاپانیوں کا قبضہ تھا۔ جنوری 1945 کو اتحادی افواج جزیرہِ رامری میں داخل ہو گئیں۔ اس مہم میں 6000 برطانوی اور ہندوستانی فوجی شامل تھے جبکہ رامری میں جاپانی مدافعین کی تعداد تقریباً 1500 تھی۔ البتہ جاپانیوں کو یہ ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ اتنے سالوں میں وہ جزیرے کے

چپے چپے سے واقف ہو چکے تھے اور انہوں نے یہاں جابجا مظبوط مورچہ بندیاں اور دفاعی لائنز قائم کر رکھی تھیں۔

دوسری طرف اتحادیوں کو یہ ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ اب رامری کے مضافاتی سمندر میں برطانوی بحریہ اور رامری کی فضاؤں میں برطانوی طیاروں کا راج تھا۔ زمینی حملے سے قبل برطانوی جنگی بحری جہاز HMS Queen Elizabeth نے رامری پر کئی گھنٹے زبردست گولہ باری کی ۔۔۔ جس کے بعد برطانوی فضائیہ کے B-24 Liberator طیاروں نے رامری کے چپے چپے کو خوفناک بمباری سے لرزا کے رکھ دیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی جب اتحادی افواج رامری میں داخل ہوئیں تو انہیں وہاں مورچہ زن جاپانی فوج کی طرف سے زبردست اور تباہ کن مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہفتے کی خونریز جھڑپوں میں۔ جہاں ایک طرف اتحادی افواج کو بھاری جانی نقصان پہنچ چکا تھا وہیں جاپانی افواج کی قدم بھی اب لڑکھڑا چکے تھے ۔۔۔ جہاں 500 سے زائد جاپانی فوجی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے وہیں سینکڑوں زخمی تھے اور ان کے پاس خوراک، پانی اور ایمونیشن کے ذخائر اب ختم ہونے کے قریب تھے۔

ایسے میں جاپانی فوج کے کمانڈر نے اپنی فوج کو دشمن کے ہاتھوں مکمل تباہی یا پھر سرنڈر و گرفتاری سے بچانے کے لیے ایک مشکل ترین فیصلہ لے لیا ۔۔ اس نے اپنی فوج کو 10 میل طویل دلدلی چمرنگ علاقے میں پسپا ہو کر جزیرے کے دوسرے کنارے تک پہنچ جانے کا حکم دیا تاکہ وقت رہتے انہیں رامری سے نکال کر واپس برما پہنچا دیے جانے کی کوئی سبیل پیدا ہو سکے ۔۔۔۔ لیکن یہ فیصلہ ایک بھیانک غلطی ثابت ہونے والا تھا۔ آدمخور دشمن جس دلدلی چمرنگ جنگل سے ہو کر بچے ہوئے 1000 کے قریب جاپانی فوجیوں (جن میں سے کئی زخمی تھے) کو نکل کر جزیرہ کی دوسرے سمت پہنچنا تھا ۔۔۔ وہ دلدل ہزاروں کی تعداد میں کھارے پانی کے مگرمچھوں Salt water crocodile کا گڑھ تھی۔ یاد رہے کہ دنیا میں ہر برس اوسطاً 1 ہزار انسان مگرمچھ کا شکار بن کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن کھارے پانی کا مگرمچھ تو کرہ ارض پر سب سے بڑا خزندہ (Reptile) مانا جاتا ہے جس کا سائز 23 فٹ تک بڑھ سکتا ہے اور وزن 1 ہزار کلوگرام تک پہنچ سکتا ہے۔ دنیا کے سبھی جانوروں میں سب سے طاقتور بائیٹ اسی مگرمچھ کی ہے جس کا دباؤ 3,700 pounds فی مربع انچ ہوتا ہے ۔۔۔ یعنی اس کے دانت سٹیل کو بھی پھاڑ سکتے ہیں۔ یہ آبی درندہ جنگلی جنگلی بھینسے، باگھ اور

بُل شارک جیسے طاقتور جانوروں تک کو مار کے کھایا کرتا ہے۔۔۔یہ درندہ باآسانی آدمخور بن سکتا ہے!
۔رامری جزیرہ پر جاپانی فوج کے 4 سالہ قیام کی بدولت جزیرے پر جانوروں کی سخت کمی ہو چکی تھی۔۔۔اتحادیوں کے بحری محاصرے کی بدولت جاپانیوں نے جزیرہ پر ہر ممکن دستیاب زمینی جانور کو اتنے عرصے میں کھایا تھا۔سانپ اور کیکڑے سے لے کر سور، خرگوش تک سبھی کچھ جاپانی ہڑپ کر چکے تھے۔نتیجتاً رامری میں موجود کھارے پانی کے مگرمچھوں کے لیے خوراک اب بہت کم تھی اور وہ سینکڑوں یا ہزاروں مگرمچھ اکثر مہینوں کے بھوکے تھے۔اور اسی وقت 1 ہزار کے قریب جاپانی فوجی اس دلدل میں داخل ہو گئے۔

خون آلود دلدل:

دلدل میں پیدل سفر کر رہے جاپانیوں میں کئی زخمی، بیمار یا مسلسل نیند، خوراک کی کمی کی وجہ سے اینگزائیٹی کا شکار تھے۔چنانچہ کئی فوجی آہستہ چلنے کی وجہ سے اصل گروپ سے پیچھے رہ گئے اور یہی وقت تھا جب کھارے پانے کے مگرمچھوں نے ان بیمار اور کمزور فوجیوں پر حملہ کر دیا۔پوری دلدل دردناک انسانی چیخوں اور فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔لیکن باقی جاپانیوں نے دلدل میں اپنا سفر جاری رکھا۔۔۔اب مگرمچھوں نے مرکزی گروپ کے ان فوجیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا کہ جو گروپ میں چند فٹ دائیں بائیں یا آگے پیچھے چل رہے تھے۔
دلدل کے مٹیالے پانی میں مگرمچھ کو آتا دیکھ پانا بھی ممکن نہ تھا اور بدقسمت فوجی کو مگرمچھ کی موجوگی کا علم تب ہوتا تھا جب وہ اس کی ٹانگ کو اپنے جبڑے میں لے کر روز سے کروٹ بدلتا تھا۔۔۔بدقسمت سپاہی کی ٹانگ ایک لمحے میں اس کے بدن سے جدا ہو جاتی اور فوارے کی طرح نکلتا خون اس مٹیالے رنگ کی دلدل کو سرخ کرنے لگتا۔لیکن اس کے ساتھی پانی میں فائر کرتے بھی تو بغیر نشانہ باندھے کیونکہ اکثر تو مگرمچھ ان کی حدِ نگاہ میں ہی نہ ہوتا تھا۔۔۔ابھی وہ ایک دم توڑتے سپاہی کو دیکھ ہی رہے ہوتے کہ کہیں اور سے دوسرا، تیسرا، چوتھا سپاہی یونہی مگرمچھوں کا شکار بن جاتا۔
پہلے سے ہی تباہ حال جاپانی فوج اب بہت بری طرح سے بوکھلا چکی تھی۔۔۔یہ دلدل صرف مگرمچھوں ہی نہیں بلکہ خطرناک مچھروں ،زہریلے سانپوں اور پائتھون اژدھوں کا بھی گڑھ تھی۔اور اس سب سے دفاع کے لیے ان کے پاس کوئی حربہ نہ تھا۔دلدل میں دور دور تک خشکی کا کوئی ٹکڑا نہ تھا کہ جہاں وہ رک کر چند گھڑی آرام ہی کر لیتے۔۔۔اور مسلسل دو دن تک پانی میں رہنے کی وجہ سے اب ان کے پاؤں اور ٹانگیں سوجھن کا شکار ہوتی جا رہی تھیں۔ساتھ ہی مچھروں نے ان کا جینا دو بھر کر رکھا تھا۔تھکاوٹ، بھوک، پیاس اور بیماری کے باعث اب مسلسل کئی فوجی مرکزی گروپ سے پیچھے رہتے جا رہے تھے۔۔۔۔اور ہر ایسے فوجی کا انت مگرمچھوں کے جبڑے میں ہوتا۔اور ان کی قبریں مگرمچھوں کے پیٹ میں بنتیں۔۔۔۔

اب جاپانی فوجیوں کے بدن کا ایک ایک خلیہ خوفناک تھکاوٹ، درد اور کمزوری کا شکار بن چکا تھا اور اب اگر ان کے اس پاس کسی فوجی پے مگرمچھ حملہ کر بھی دیتا تو وہ کچھ نہ کرتے بلکہ چپ چاپ بڑھتے رہتے جبکہ ان کے ساتھی کو مگرمچھ زندہ چبانے میں مصروف رہتا ۔ کئی مہینوں سے بھوکے مگرمچھوں کو اتنی آسان اور لذیذ خوراک میسر آئی تو انہوں نے بھی جاپانیوں کی تکا بوٹی میں قطعاً کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جہاں جہاں سے جاپانی گزر رہے تھے وہاں دلدل کا رنگ سرخی میں بدلتا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ چند دن بعد دلدل سے زندہ نکل کر پرلے کنارے پر پہنچ جانے والے جاپانیوں کی تعداد 100 سے 200 کے قریب ہی تھی۔ دلدل میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والے جاپانیوں میں کم از کم 500 وہ تھے کہ جنہیں مگرمچھوں نے اپنا نوالہ بنالیا تھا۔

17 فروری کو جاپانی طیاروں نے رامری کے نزدیک سمندر میں بمباری کرتے ہوئے برطانوی بحریہ کے ایک ڈسٹرائر جہاز کو ڈبو دیا۔ جس کے باعث بچے ہوئے جاپانیوں کو اتنا موقع مل گیا کہ وہ چند کشتیوں پر رامری سے واپس برما فرار ہو کر اپنی جان بچا سکیں۔ اور اس طرح باقی جاپانیوں کی جان بچ گئی۔ فروری 1945 کو جزیرہِ رامری پر اتحادیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ بدقسمتی سے۔۔۔ بعد کی دہائیوں میں غیر قانونی شکار اور سمگلنگ کی وجہ سے رامری کے مگرمچھوں کی آبادی میں اتنی کمی آئی کہ اب جزیرہ رامری پر مگرمچھوں کی تعداد محض اب گنتی کی ہی رہ گئی ہے۔

بحوالہ کتاب:

The Burma Campaign از فرینک مکلین۔

اس موضوع پر فلم:

Saltwater: The Battle for Ramree Island

آخری ہتھیار

1943 اتحادی افواج کی طرف سے جاپانی قابضین کے خلاف برما کے محاذ پر لانچ کیا گیا Operation Matador اپنے عروج کے دنوں میں تھا۔

3 مارچ 1943 امریکی فضائیہ کے 12 عدد B-24 لبریٹر، بمبار طیاروں نے ہندوستان میں مغربی بنگال میں اپنی بیس سے اڑان بھری۔۔۔ان کا ہدف تھا برما کے شہر "پیانمانہ" میں قائم ایک پُل کہ جسے جاپانی افواج نقل و حرکت کے لیے باقاعدگی سے استعمال کرتی آئی تھیں۔اس پل کو تباہ کرنا اتحادیوں کے لیے ایک اہم ٹاسک تھا!

امریکی طیاروں کو برما کی حدود میں داخل ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ افق سے 13 عدد جاپانی Nakajima Ki-43 لڑاکا طیارے نمودار ہوئے۔۔۔ اور ہر دو گروپوں کی ایک دوسرے پر مشین گن فائرنگ کی تڑتڑاہٹ سے آکاش لرز اٹھا۔پہلے حملے میں ہی ایک امریکی بمبار طیارہ گولیوں سے چھلنی ہو گیا اور اس میں آگ بھڑک اٹھی۔۔۔عملے کے پاس پیراشوٹ کی مدد سے جلتے طیارے سے چھلانگ لگا دینے کے سوا اور کوئی آپشن نہ تھا۔

چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا! عملے کے دس افراد اب پیراشوٹ کی مدد سے زمین کی طرف گامزن تھے۔۔۔ لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔۔۔ان کے طیارے کو تباہ کرنے والے جاپانی لڑاکا طیارے ابھی تک فضا میں ہی تھے۔

چنانچہ جاپانیوں طیاروں نے اب پیراشوٹ کی مدد سے کودچکے امریکی ہوابازوں پر فائرنگ شروع کر دی۔۔۔ جس میں ایک ہواباز کو گولیاں لگیں اور وہ مارا گیا جبکہ دوسرے کا پیراشوٹ پھٹ گیا اور وہ ہزاروں فٹ کی بلندی سے زمین پے گر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔بچے ہوئے 8 ہواباز جو جاپانی طیاروں کی مشین گنز سے برستے آتش و آہن کی زد میں تھے انہیں میں شامل تھا کو-پائلٹ "

Owen J. Baggett۔ بیگٹ کو بھی بازو میں ایک گولی لگ چکی تھی اور وہ زخمی تھا۔ اس کے پاس اپنے دفاع کے لیے کوئی ہتھیار نہ تھا ماسوائے اس کے M1911 سروس پسٹل کے۔۔۔۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے پسٹل نکالا۔۔۔ اور جان بوجھ کر اپنی گردن یوں لڑھکا دی کہ جیسے وہ مر چکا ہو۔ تاکہ جاپانی ہوا باز اس پر مزید فائرنگ کرنے سے باز رہیں۔ لیکن۔۔۔۔ وہ زندہ تھا۔۔۔۔ اور تیار تھا، تاریخ کی سب سے حیرت انگیز طیارہ شکن کارروائی کے لیے۔ جیسے ہی ایک جاپانی طیارہ اس کے نزدیک سے گزرا اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور اندھا دھند اپنے پسٹل کی سب گولیاں اس پے فائر کرنے لگا۔۔۔۔ اس نیت سے کہ شاید کوئی گولی طیارے کے فیول ٹینک کو جا لگے اور وہ دھماکے سے پھٹ جائے یا اس میں آگ بھڑک اٹھے۔

لیکن۔۔۔

گولی کوئی طیارے کے فیول ٹینک کو نہ لگ سکی۔ اب بیگٹ کو ایک بھیانک موت سے کوئی نہ بچا سکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اب وہ طیارہ پلٹے گا اور اسے گولیاں سے اڑا دیا گا۔ لیکن۔۔۔ ایسا کچھ نہ ہوا۔ بلکہ بیگٹ نے دیکھا کہ پہلے کچھ دیر وہ طیارہ خط مستقیم میں محو پرواز رہا اور پھر اس کا رخ زمین کی طرف ہو گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا بیگٹ کو اس کا علم نہ تھا۔ کیونکہ اب زمین بتدریج نزدیک آتی جا رہی تھی اور بیگٹ برما، یعنی دشمن کے علاقے میں لینڈ کر رہا تھا۔

زمین پر پہنچنے کے بعد بیگٹ نے پیراشوٹ سے نجات حاصل کی اور نزدیک موجود درختوں کے جھنڈ میں چھپنے کی کوشش کی۔۔۔۔ لیکن جلد ہی جاپانی فوج نے گرفتار کر لیا۔ بیگٹ کے اگلے 2 برس، پہلے رنگون (برما) اور پھر سنگاپور میں جاپانی فوج کی قید میں گزرے۔ یہاں تک کہ اسے جنگ کے اختتام کے بعد رہا کر دیا گیا۔

لیکن۔ اس جاپانی ہوا باز کا کیا ہوا؟ اس کا تباہ شدہ طیارہ اگلے روز ایک ساحلی پٹی کے نزدیک ملا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ جب بیگٹ نے اس پر اپنے پسٹل سے فائرنگ کی تھی تو خوش قسمتی سے ایک گولی طیارے کی کھلی کینوپی سے ٹھیک جاپانی پائلٹ کے ماتھے کو پھاڑتی ہوئی اس کے دماغ میں جا لگی تھی جس سے موقعے پر ہی اس کی موت ہو گئی اور اس کے طیارے کا رخ زمین کی طرف ہو گیا۔ جب جاپانیوں نے تباہ شدہ طیارے کا ملبہ اور پائلٹ کی کٹی پھٹی لاش برآمد کی تو اس کے سر پے ایک ہی گولی کا نشان تھا جبکہ اس کے علاوہ طیارے یا پائلٹ کے جسم پر گولی کا کوئی اور نشان نہ تھا۔ جنگ کے ان مخدوش دنوں میں جاپانیوں نے اس کیس پر زیادہ وقت برباد نہ کیا اور یہ کہہ کر معاملہ کلوز کر دیا کہ یہ گولی کسی دوسرے جاپانی طیارے کی فائرنگ کے دوران کی غلطی سے اس پائلٹ کو آ لگی۔۔۔۔ حالانکہ۔۔۔ اگر مذکورہ جاپانی طیارہ کسی اور جاپانی طیارے کی مشین گن فائرنگ کی زد میں آیا ہوتا تو طیارے کی باڈی اور پائلٹ کے جسم پر گولیوں کے بیسیوں نشان ہوتے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس طیارے کی کینوپی کھلی ہوئی کیوں تھی؟

تو یہ اس دور میں بالکل عام سی بات تھی۔۔۔۔اکثر پائلٹ اردگرد یا زمین کی طرف صحیح طرح سے دیکھ پانے یا پھر کاک پٹ میں شدید گرمی ہو جانے کی وجہ سے دوران پرواز کچھ دیر کے لیے کینوپی کھول لیا کرتے تھے۔
لیکن پستول کی مدد سے دشمن طیارے پر حملے کا یہ واقعہ واحد نہ تھا۔

----

4 اپریل 1945 کو بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا جب ایک امریکی "L4 گراس ہوپر" طیارے کا ٹاکرا جرمن Fi 156 Storch طیارے سے ہوا۔
یہ دونوں ہی جاسوس طیارے تھے جن میں کوئی ہتھیار نصب نہ تھے۔
چنانچہ امریکی طیارے کے پائلٹ اور معاون دونوں نے اپنے سروس پسٹلز سے جرمن طیارے پر فائرنگ شروع کر دی جس میں طیارے کو کئی گولیاں لگیں اور ایک جرمن ہوا باز زخمی بھی ہوا۔۔۔۔انہیں ہنگامی طور پر طیارہ لینڈ کرنا پڑ گیا۔ جہاں زمین پر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔
نوٹ: کور فوٹو میں موجود تصویر حقیقی نہیں بلکہ تمثیل کاری ہے!

آتشی غبارہ

اگر آپ کو بتایا جائے کہ دنیا کا پہلا "بین البراعظمی ہتھیار" کوئی راکٹ یا میزائل نہیں بلکہ ایک ہائیڈروجن بیلون تھا تو شاید آپ کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہو!

اپنی تحریر "چمگادڑ بم" میں میں نے تفصیل سے بتایا تھا کہ امریکہ نے جنگِ عظیم دوئم کے دوران جاپان پر انسینڈری بم گرانے کے لیے چمگادڑوں کے استعمال کا منصوبہ بنایا تھا۔۔۔

بالکل اسی طرح دوسری جنگ عظیم میں جاپان نے بھی امریکہ پر انسینڈری بم گرانے کے لیے غباروں کا استعمال کیا۔

آتشی غبارے:

دوسری جنگِ عظیم کے چلتے، جاپان کو اتحادی افواج کے ہاتھوں روزانہ کی بنیاد پر ناقابل تلافی حد تک بھاری جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا اور جاپان بے صبری سے کسی بھی ایسے ممکنہ منصوبے یا ہتھیار کی کھوج میں تھا کہ جس سے براہ راست امریکہ کی سرزمین پر حملہ کیا جاسکے۔

اس سلسلے میں ایک منصوبہ Fu-Go Balloon بم کا تھا یعنی ایسے ہائیڈروجن غبارے جن کے ساتھ انسینڈری بم باندھ کر انہیں امریکہ پر حملے کے لیے استعمال کیا جاسکے۔

1944 میں فوگو غباروں کی پروڈکشن پر کام شروع کیا گیا اور نومبر 1944 تک پہلے فوگو غبارے تیار ہو چکے تھے۔

اس غبارے کا بم سمیت وزن 12 سے 15 کلوگرام تک تھا۔ انہیں امریکہ تک کا واحد زریعہ یہی تھا کہ ان غباروں کو بحر الکاہل میں جاپانی بحریہ کے جہازوں سے اڑا دیا جاتا تھا۔۔۔ تاکہ یہ اڑ کر 4 سے 5 دن میں کر امریکہ اور کینیڈا میں جا گریں اور وہاں بلاسٹ ہو جائیں۔ مجموعی طور پر جاپان نے امریکہ اور کینیڈا پر 9300 فوگو غبارے داغے۔۔۔۔ لیکن۔۔۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہوا کا رخ، بہاؤ اور رفتار ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔ ان 9300 میں محض 1 ہزار کے قریب غبارے ہی امریکہ اور کینیڈا تک پہنچ پائے۔ باقی غبارے
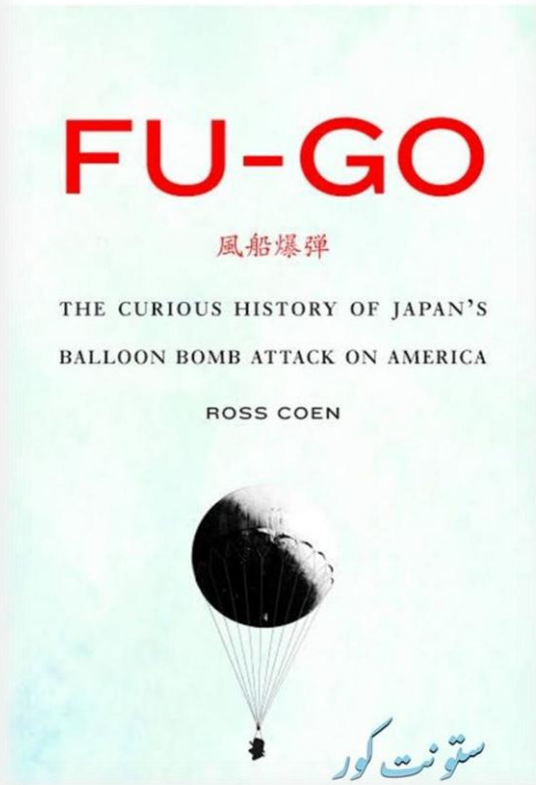
سمندر میں ہی گر کر ڈوب گئے اور ضائع ہو گئے۔۔۔۔ جبکہ 2عدد فو گو غبارے تو الٹا جاپان کی طرف ہی واپس آکر جاپان میں پھٹے۔

جو 1 ہزار کے قریب فو گو غبارے امریکہ و کینیڈا میں گرے میں سے تقریباً500 بم پھٹ نہ پائے اور انہیں ناکارہ بنا دیا گیا۔ دیگر 500 کے نزدیک بموں کے پھٹے سے کوئی قابل ذکر نقصان نہ ہوا۔ کئی مقامات پر ان بموں کے پھٹنے سے آگ لگی جسے بروقت بجھا دیا گیا اسی طرح کئی افراد زخمی بھی ہوئے لیکن ان حملوں میں مجموعی طور پر صرف 7 اموات ہوئیں اور یہ واقعہ 5 مئی 1945 کو اوریگن میں پیش آیا کہ جب ایک فیملی پکنک کے دوران فو گو غبارہ نزدیک گرا تو پانچ بچے جنہوں نے اسے گرتے دیکھا وہ اسے کھلونا سمجھ کر اس کے ساتھ کھیلنے لگ گئے یہاں تک کہ ان کی ماں 'ایلسی مچل' جب ان کے نزدیک پہنچی تو بم، بلاسٹ ہو گیا اور موقعے پر ہی ان 6 افراد کی موت ہو گئی۔ ایلسی اس وقت حاملہ تھی۔

1945 میں ہی جنگِ عظیم کے خاتمے کے ساتھ ہی اس ہتھیار کا بھی اختتام ہو گیا۔

بحوالہ کتاب:FU-GO by Ross Coen.

ٹینک شکن کتے

دنیا میں آج تک جنگوں میں جن دو جانوروں کو سب سے زیادہ استعمال کیا گیا ہے وہ ہیں گھوڑے اور کتے، گھوڑوں کو سواری اور بار برداری کے لیے اور کتوں کو دشمن کی کھوج لگانے، بم بارود یا زمینی سرنگوں کو سونگھ کر ڈھونڈنے یہاں تک کہ پیغام رسانی تک کے لیے بھی استعمال کیا جا چکا ہے۔ تاہم جنگِ عظیم دوئم کے دوران روس نے پہلی مرتبہ کتوں کو بطور ٹینک شکن، بکتر شکن اور فوجی ٹرک، جیپ شکن مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ جس کے بارے میں ہم جانیں گے اس تحریر میں۔

پسِ منظر:

22 جون 1941 کو جرمنی نے روس پر ایک وسیع اور بڑے پیمانے کا حملہ کر کے اس پر ایک فل سکیل جنگ مسلط کر دی۔۔۔ روس اس جنگ کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ جرمن فضائیہ نے جنگ کے پہلے ہفتے میں ہی روسی فضائیہ اور آرمر کے اکثریت حصے کا صفایا کر ڈالا۔ ادھر زمین پر روسی افواج کو اس تیزی سے، پیش قدمی کرتی جرمن فوج سے بچتے ہوئے پیچھے ہٹنا پڑ رہا تھا کہ وہ بھاگتے ہوئے، بھاری ترین مقداروں میں اپنا ہر قسم کا اسلحہ بھی پیچھے چھوڑ گئے جس پر آگے چل کر جرمن افواج نے قبضہ کر لیا۔ اب روس کے پاس ٹینکوں اور ٹیکن شکن ہتھیاروں دونوں کی تعداد بیحد کم اور ناکافی تھی اور اس محدود تعین آرسنل کے ساتھ انہیں دنیا کے سب سے بڑے ملک یعنی روس کا دفاع کرنا پڑ رہا تھا۔

چنانچہ اب روس کو جرمنی کے ہاتھوں بدترین شکست سے بچانے کی خاطر روسی افواج جرمن فوج کے خلاف ہر ممکن دستیاب وسائل اور ہتھیار استعمال کرنے پر آمادہ تھیں۔ اسی سلسلے میں ایک عجیب و غریب ہتھیار تھا ٹینک شکن کتے۔

کانسیپٹ:

اس کانسیپٹ کے تحت تربیت یافتہ السیشن کتوں کے جسم پر کینوس کے بیگ میں 10 سے 12 کلو وزنی بم باندھ کر انہیں محتاط فاصلے سے دشمن کے ٹینکوں پر چھوڑ دیا جاتا۔۔۔ کتا بھاگتا ہوا دشمن کے ٹینک تک پہنچے گا تو اس کا ہینڈلر ریموٹ کنٹرول کے ذریعے بم کو بلاسٹ کر دے گا۔ جس سے ٹینک اگر مکمل تباہی نہیں تو کم از کم اس کے ٹریکس ٹوٹ جائیں گے اور وہ جنگ سے باہر ہو جائے گا۔

تربیت:

ٹینک شکن کتوں کی تربیت کے لیے ماسکو میں ٹریننگ سینٹر قائم کیا گیا جس میں آرمی اور پولیس ڈاگز کے ٹرینرز اور سرکس کے جانوروں کو تربیت دینے والے ماہرین کو تعینات کیا گیا۔

ٹریننگ کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے کتوں کو خوب بھوکا رکھا جاتا تھا۔ پھر ان کی خوراک کو لکڑی سے بنے کچھ مصنوعی ٹینکوں، سپلائی ٹرکوں، فوجی جیپوں کے نیچے رکھ کے کتوں کو چھوڑ دیا جاتا اور وہ بھاگتے ہوئے ان کے نیچے جاتے اور وہاں سے اپنی خوراک حاصل کر لیتے ۔ یہاں تک کہ کتوں کے ذہن میں ٹینکوں اور جنگی گاڑیوں کی شکل راسخ ہو گئی اور ان کے ذہن میں یہ بات منجمد ہو گئی کہ ان کو خوراک ملے گی تو وہیں سے۔

استعمال:

روسی فوج نے جرمن فورسز کے خلاف ٹینک شکن کتوں کا استعمال 1941 کے اواخر میں شروع کر دیا۔ مجموعی طور پر 100 کے قریب کتے اس مہم میں شامل تھے جن میں 30 کتے پہلے گروپ میں تھے۔ لیکن۔ یہ منصوبہ انتہائی بری طرح سے ناکام ہو گیا۔ اور سوائے دو چار ٹینکوں کو نقصان پہنچنے کے اس ٹیکٹک کا کوئی فائدہ نہ ہو پایا۔ کتے بھی سب کے سب ان کارروائیوں میں مارے گئے۔

ناکامی کی وجوہات:

اول یہ کہ کتوں کو تربیت دی گئی تھی خاموش اور پر سکون ماحول میں ۔ جب انہیں انتہائی شور، گرد و غبار, دھویں، فائرنگ اور گولے باری کی آوازوں سے بھرے محاز پر چھوڑا جاتا تھا تو وہ کنفیوز ہو جاتے تھے اور ادھر ادھر بھاگ نکلتے تھے۔ دوسرا یہ کہ ان کی تربیت ٹینک و گاڑیوں کے ماڈلز پے کہ گئی تھی جو ساکن تھے۔ جبکہ جنگ میں اصل ٹینک متحرک ہوتے تھے اور کتے ان ٹینکوں کو بھاگتا دیکھ کر ڈر جاتے تھے کہ جنہیں تربیت کے دوران ہمیشہ انہوں نے ساکن ہی دیکھا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ جرمن ٹینکوں کا عملہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ پہلے تین چار ٹینکوں پر "کُت کُش" حملوں کے بعد دیگر کتوں کو صحیح سلامت اپنے ٹینکوں تک پہنچنے دیتے ۔۔۔ اب کی بار وہ دور سے ہی کتوں کو دیکھ کر ٹینک کی مشین گنز کی مدد سے انہیں بہت دور ہی شوٹ کر دیتے تھے۔

اختتام:

1942 میں اس پراجیکٹ کو ختم کر دیا گیا۔

ہاں 2005 میں عراق جنگ کے دوران ال ۔۔۔ قا ۔۔۔ عدہ نے ایک کتے کو اسی طرح بم لگا کر امریکی فوج پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بم وقت سے پہلے پھٹ گیا۔

چرچل جائے جہنم میں

برطانیہ کے سابق بحریہ افسر، سابق وزیر اعظم اور جنگ عظیم دوئم کے فاتح ونسٹن چرچل سے ایک واقعہ منسوب ہے ۔۔۔۔۔1930 کی دہائی میں، ان کے وزیر اعظم بننے سے قبل ایک روز چرچل BBCلندن ریڈیو کے لیے تقریر کرنے جارہے رہے تھے۔ انہوں نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور سے ریڈیو آفس چلنے کی درخواست کی۔ جس پر ڈرائیور نے جواب دیا" معذرت۔ میں آپکو نہیں لیجا سکتا میں گھر جارہا ہوں اور میں نے گھر پہنچ کے چرچل کی تقریر سننی ہے۔۔۔۔ میں دل و جان سے ان کا حمایتی ہوں"۔(ڈرائیور پہچان نہ پایا تھا کہ اس کے مخاطب بذات خود چرچل ہی ہیں۔)

The Taxi Driver Who Told Passenger "Winston Churchill Can Go To Hell" Without Knowing It Was Winston

یہ سن کر چرچل بیحد خوش ہوئے اور انہوں نے جیب سے ایک پاونڈ کا نوٹ نکال کر ڈرائیور کو دیا۔۔۔اس دور میں ایک پاونڈ بھی اچھی خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ڈرائیور اتنی اچھی رقم ملنے پر خوشی سے کھل اٹھا اور بے ساختہ بول اٹھا

" چرچل جائے جہنم میں۔۔۔۔۔ آیئے میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

عقلمند ہائیکر

اکتوبر 2021 ۔ امریکی ریاست کالوراڈو کی سب سے بلند پہاڑ "ماونٹ البرٹ" (4401 میٹر بلند) پر ہائیکنگ کی غرض سے گئے ایک امریکی ہائیکر کو اس وقت لاپتہ قرار دے دیا گیا کہ جب وہ 18 اکتوبر کو مقررہ وقت پر واپس بیس کیمپ نہ پہنچ سکا ۔اس کی گمشدگی کی اطلاع ایک مقامی ریسکیو ادارے LCSR (لیک کنٹری سرچ اینڈ ریسکیو) کو کر دی گئی۔ مذکورہ ادارے کے اہلکاروں نے اسے سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن بیسیوں مرتبہ کال کرنے، وائس میل اور میسجز کرنے کے بعد بھی انہیں کوئی جواب نہ مل سکا نہ ہی ہائیکر کی طرف سے کوئی کال ریسیو کی گئی۔ برف سے اٹے، خطرناک گھاٹیوں اور گہری کھائیوں سے بھرے اس دشوار گزار پہاڑ میں اس کا یوں لاپتہ ہو جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ LCSR نے اس کی کھوج لگانے کے لیے فوری طور پر ریسکیو ٹیم ماونٹ البرٹ کی طرف روانہ کر دی۔ خوش قسمتی سے 24 گھنٹے کی تلاش کے بعد مذکورہ ہائیکر کو ڈھونڈ کر ریسکیو کر لیا گیا۔ ریسکیو ٹیم کے ہائیکر کو ساتھ لے کر واپس پہنچنے پر جب اس سے تفتیش کی گئی کہ اتنی فون کالز اور میسجز کا جواب کیوں نہیں دیا؟؟؟

تو اس نے جواب دیا۔ "کیونکہ نمبر میرے لیے انجان Unknown تھا"۔

انوکھا ڈاکو

یہ واقعہ 28 نومبر 2009 کو پولینڈ میں پیش آیا۔۔۔اس روز مغربی پولینڈ کے شہر Lubin میں ایک بنک میں معمول کا کام جاری تھا جب ایک انجان شخص بنک میں داخل ہوا اور اور کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔کاؤنٹر پر 2 لڑکیاں بطورِ کیشیئر تعینات تھیں ۔اجنبی شخص نے جیب سے ایک چمچ۔۔۔چاول، دلیہ کھانی والی ایک عام چمچ نکالی اور اسے دونوں کیشیئرز کے سامنے لہراتے ہوئے کرخت آواز اور تحکمانہ لہجے میں کہا "اپنی سلامتی چاہتی ہو تو دراز میں جتنی بھی کیش موجود ہے فوراًمیرے حوالے کردو".

اس ڈاکو کے ہاتھ میں پکڑے اس "خطرناک جنگی ہتھیار" کو دیکھ کر اصولاً تو ان کا قہقہہ بلند ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے انہوں نے چیخ کر بنک میں موجود سبھی ملازمین و گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔۔۔شور مچنے پر ڈاکو گھبرا گیا اور فوراًبنک سے فرار ہوگیا۔پولیس کو اطلاع کیے جانے پر، جب پولیس "جائے واردات" پہنچی اور CCTV کیمروں کی فوٹیج چیک کی گئی تو پولیس نے اس ملزم کی تصویر جاری کرتے ہوئے بیان دیا کہ "بھلے ہی یہ واقعہ عجیب و غریب نوعیت کا ہے تاہم یہ غیر قانونی ہے لہٰذا ہم ملزم کو تلاش کریں گے".

بعدازاں وہ مجرم کبھی گرفتار نہ ہو پایا۔۔۔

ضرورت، ایجاد کی ماں ہے

یوں تو دنیا میں پہلی مشین گن امریکی موجد، رچرڈ جارڈن نے 1861 میں ایجاد کی۔۔۔ تاہم دنیا کی پہلی خودکار مشین گن کی ایجاد کا سہرا امریکی نژاد برطانوی موجد Hiram Maxim کے سر ہے۔
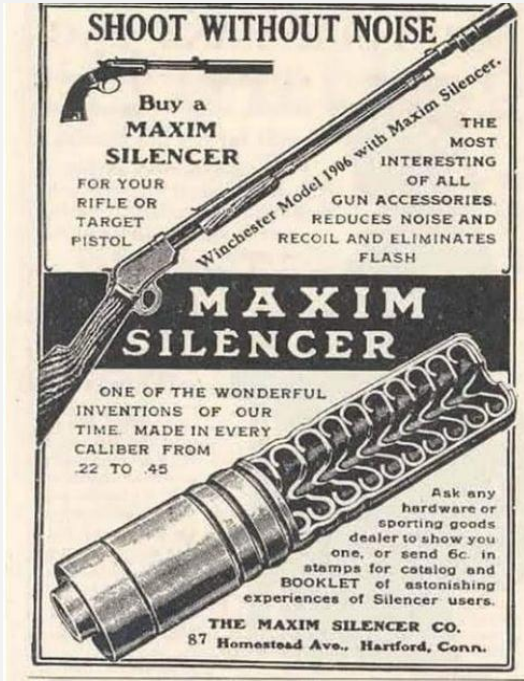
1884 میں تیار ہونے والی اس مشین گن کو اس کے موجد کی نسبت سے Maxim Gun کہا جاتا تھا۔ میکسم ایک محنتی اور جفاکش شخص تھے جو کہ اس خودکار مشین گن کی ایجاد کے بعد طویل عرصے تک اس کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے تجربات میں مگن رہے اور ظاہر ہے اس سارے عرصے میں انہیں روزانہ کی بنیاد پر کئی راونڈز فائر کرنے پڑتے تھے۔۔۔ لیکن۔۔۔ اس دور میں اب تک مشین گن فائرنگ کی آواز سے حفاظت کے لیے ائیر پروٹیکشن ایجاد نہیں ہوئی تھی (عام ہتھیاروں کی آواز سے حفاظت کے لیے ائیر پروٹکشن 1864 میں ایجاد ہو چکی تھی لیے مشین گن کی ائیر پروٹیکشن تب تک موجود نہ تھی)۔

چنانچہ روزانہ کی بنیاد پر شوٹنگ کی وجہ سے میکسم کی قوتِ سماعت پر برے اثرات مرتب ہونے لگے۔۔۔ آنے والے سالوں میں میکسم کی سماعت بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی اور انہیں کم اور اونچا سنائی دینے لگا۔ ہیرام میکسم کا بیٹا "پرسی میکسم" اپنے باپ کی بگڑتی قوتِ سماعت کی وجہ سے بہت پریشان تھا اور اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی۔ چنانچہ پرسی نے بذاتِ خود ایک ایسی ڈیوائس کی تیاری پر کام شروع کر دیا کہ جو مشین گن کی آواز کو محدود کر سکے۔۔۔

کئی برس کی محنت کے بعد آخر کار 1902 میں پرسی میکسم ایک ایسی ڈیوائس ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ جس سے مشین گن فائرنگ کی آواز کو دبایا جا سکتا تھا۔۔۔ اسے Maxim silencer کا نام دیا گیا۔

لیکن۔۔۔ بدقسمتی سے تب تک ہیرام میکسم مکمل طور پر بہرے ہو چکے تھے اور اب یہ سائلنسر ان کے کسی کام کا نہیں تھا تاہم۔۔۔ میکسم سائلنسر نے جنگِ عظیم اول میں ہزاروں سپاہیوں کو سماعت کھونے سے محفوظ رکھا۔ اس طرح پرسی میکسم کی یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

گمشدہ ہواباز

دسمبر 1971, جنوبی ایشیاء دوازلی دشمن پڑوسی پاکستان اور بھارت 10 دن سے حالتِ جنگ میں تھے۔

13 دسمبر 1971 کو بھارتی فضائیہ کے Mig طیاروں کے ایک سکوارڈن کو گجرات سے سندھ تک پرواز کرتے ہوئے بدین میں قائم پاکستانی افواج کے ایک زیرزمین ہیڈکوارٹر بنام "بدین کمپلیکس" کو نشانہ بنانے کا ٹاسک ملا۔

گزشتہ 10 دن میں بھارتی فضائیہ اس ہدف کو متعدد مرتبہ نشانہ بنانے کی کوشش کرچکی تھی لیکن تاحال انہیں کوئی مناسب کامیابی نہ مل پائی تھی جس کی دووجوہات تھیں:

✓ یہ زیرزمین عسکری تنصیب کنکریٹ کی نہایت دبیز دیواروں اور دھری حفاظتی لائنوں کے اندر قائم تھی اور بھارتی فضائیہ کے مروج 57mm راکٹ اسے چھید پانے سے قاصر تھے۔

✓ بدین کمپلیکس اور اس کے آس پاس پاکستانی افواج نے 8.8 سم کی طیارہ شکن فلیک گنز کا جال بچھار کھا تھا۔

دسمبر کو بدین کمپلیکس پر حملے کے لیے روانہ کیے جانے والے 4 طیاروں پر مشتمل گروپ کے لیڈر "ونگ کمانڈر ہرسرن گل" عرف "ہائی سپیڈ گل" تھے۔ ہائی سپیڈ گل 6 جولائی 1933 کو نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ 1954 میں انہوں نے 20 سال کی عمر میں ائیر فورس جوائن کرلی اور بہت جلد ان کا شمار روسی ساختہ مِگ-21 طیارے کے پائلٹس میں ہونے لگا۔ اب 38 سالہ ہائی سپیڈ گل 13 دسمبر 1971 کے روز بدین کمپلیکس پر راکٹ باری کے لیے بھیجے جانے والے 4 مِگ۔ طیاروں کے گروپ کو لیڈ کررہے تھے۔ دیگر تین پائلٹس کے نام وینے کپلیا، بوپرائی اور سونی تھے۔

بوپرائی نے بعد میں بیان کیا کہ "اس روز حملے پر جانے سے قبل ہائی سپیڈ گل اپ سیٹ تھا اور اس نے گروپ لیڈر ہونے کے باوجود اپنے طیارے کی جگہ تبدیل کرتے ہوئے اسے حملے میں دوسرے نمبر پر لے آیا اور سب سے آگے میں تھا۔". بوپرائی نے مزید بیان کیا کہ "بدین کمپلیکس پر حملے کے بعد جب ہم واپس مڑے تو کچھ فاصلے تک جانے کے بعد مجھے ہائی سپیڈ گل کا طیارہ نہیں نظر آرہا تھا ---چنانچہ میں خطرے کے باوجود پیچھے کو مڑا اور پھر سے ٹارگٹ ایریا کے قریب پہنچا جہاں میں نے قریب ہی زمین پر آتشزدگی اور دھواں اٹھتے دیکھا۔-- صاف ظاہر تھا کہ ہائی سپیڈ گل کے طیارے کو پاکستانی طیارہ شکن گنز نے مار گرایا تھا۔-- لیکن میں نے اسے ایجکٹ کرتے نہیں دیکھا۔".

اسی شام --- حیدرآباد کے ایک ریڈیو سٹیشن پر یہ پیغام نشر کیا گیا کہ "بدین کی فضاؤں میں دشمن کے ایک طیارے کو گرادیا گیا ہے۔

اس کے پائلٹ کو گرفتار کرلیا گیا ہے جس کا تعلق Hindon Air base سے ہے۔۔۔".

یہ بات حقیقت تھی، جنگ سے قبل ہائی سپیڈ گل کی تعیناتی اسی ہوائی اڈے پر تھی۔

لیکن اسی روز پاکستان میں ایک اور ریڈیو نشریات پر یہ پیغام نشر کیا گیا کہ "تباہ شدہ طیارے کا پائلٹ ہر سرن گل طیارے کے ساتھ ہی جل کے ختم ہو گیا ہے اور اس کو پہچانا جانا ممکن نہیں"....(تو پھر نام اور اس کے ائیر بیس کا نام کیسے پتا چلا؟).

----

3 دن بعد اس جنگ کا اختتام ہو گیا۔ اس جنگ کے دوران بھارت نے پاکستان کے 92,753 افراد (فوجی و سویلینز) کو قیدی بنایا جبکہ پاکستان نے بھارت کے 14 ہوابازوں سمیت 616 افراد کو جنگی قیدی بنایا تھا۔

بھارتی فضائیہ کے مطابق "ہائی سپیڈ گل لاپتہ تھا"... جبکہ پاکستان نے اسے پہلے گرفتار اور پھر "مقتول" قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ ان 616 قیدیوں کی فہرست میں ہائی سپیڈ گل کا نام شامل نہ تھا۔

"شملہ معاہدہ" کے طے پا جانے کے بعد ہر دو ممالک نے ایک دوسرے کے سبھی قیدیوں کو رہا کرتے ہوئے واپس اپنے اپنے ممالک بھیج دیا۔۔ تاہم ظاہر ہے ان میں "لاپتہ ہائی سپیڈ گل" شامل نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس کی باقیات کو بھی کبھی واپس نہیں بھیجا گیا. میں پہلی مرتبہ بھارتی پالیمنٹ کے سامنے ان 40 بھارتی افسران و اہلکاروں کی فہرست پیش کی گئی کہ جو 1971 کی جنگ میں لاپتہ ہو گئے تھے اور اس فہرست میں ہائی سپیڈ گل کا نام بھی شامل تھا۔

1972 میں لاپتہ گل کی بیوی بسنتی نے حکومت سے درخواست کی کہ وہ اس کے خاوند کی تلاش اور بازیابی میں مدد کریں۔ چنانچہ بھارتی حکومت نے حکومت پاکستان سے ایک مرتبہ پھر سرکاری سطح پر، ہائی سپیڈ گل سے متعلق استفسار کیا جس پر پاکستان کا جواب کچھ یوں تھا "ہٹ ہونے کے بعد طیارے کا پائلٹ ایجکٹ نہ کر سکا تھا اور اسی لیے طیارے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ طیارے میں شدید نوعیت کی آگ بھڑک جانے کی وجہ سے اس کی باقیات کو نہیں ریکور کیا جا سکا۔۔۔ پاکستان کو مقتول پائلٹ کے نام کا علم تب ہوا کہ جب بھارتی ریڈیو سٹیشنز پر اس کا نام، گمشدگی کی خبر کے ساتھ نشر کیا گیا۔۔۔۔" لیکن اس جواب میں ایک بہت ہی بڑا جھول موجود تھا۔۔ کیونکہ بھارت نے 12 مئی 1972 سے قبل کبھی گمشدہ پائلٹ کی تفصیلات نشر ہی نہ کی تھیں۔۔۔ پھر ایک سال قبل ہی پاکستان کو ان سب تفصیلات کا علم کیسے ہوا ہو گا؟

پھر چند برس بعد امید کی ایک کرن جاگی۔۔۔

بسنتی کی بہن برطانیہ میں بطورِ فلائیٹ اٹینڈنٹ کام کرتی تھی جہاں اس کی دوستی ایک پاکستانی فلائیٹ اٹنڈنٹ سے ہوئی اور اس فلائیٹ اٹینڈنٹ کا رشتہ بدین سے ہوا تھا۔

اس نے اپنے پاکستانی کولیگ کو اپنا مدعا بتاتے ہوئے اس سے مدد کی درخواست کی، جس پر اس نے بدین میں اپنی منگیتر کے خاندان سے رابطہ کیا اور ان سے کسی ایسے ممکنہ دشمن ہوا باز سے متعلق استفسار کیا کہ جسے 1971 کی جنگ میں قیدی بنایا گیا ہو۔۔۔ اور وہاں سے ملنے والی معلومات سنسنی خیز تھیں۔ پاکستانی فلائیٹ اٹینڈنٹ کی منگیتر نے اسے دسمبر 1971 کے ایک واقعہ سے متعلق بتایا کہ جب دشمن کا ایک طیارہ مار گرائے جانے کے بعد دشمن کے ہوا باز نے پیراشوٹ کی مدد سے چھلانگ لگا دی تھی اور اس نے ان کے گھر کے نزدیک ہی لینڈ کیا تھا جسے بعد ازاں گرفتار کر لیا گیا تھا۔۔۔ اس نے مزید بتایا کہ گرفتار دشمن ہوا باز کا سر بالوں سے خالی تھا". لیکن بسنتی کو ان معلومات سے اس لیے مایوسی کا سامنا کرنا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا خاوند ہائی سپیڈ گل گنجا نہیں تھا۔ لیکن ۔۔۔۔ کچھ ہی وقت بعد بسنتی کا رابطہ بوپرائی سے ہوا۔ جس نے یہ لرزہ خیز انکشاف کیا کہ آخری مشن پر جانے سے کچھ دن قبل ہی ہرسرن نے اپنے سر کے بال صاف کروا دیے تھے۔۔۔

اب صاف واضح ہو چکا تھا کہ ہائی سپیڈ گل فی الحقیقت اس دن بچ نکلا تھا اور بعد ازاں اسے گرفتار کر لیا گیا۔۔۔

لیکن۔ آخر پاکستان کے ہائی سپیڈ گل کی گرفتاری کو چھپانے کی کوشش کیوں کی ؟

اسے قیدیوں کے تبادلے کے دوران رہا کیوں نہ کیا گیا؟

1979 میں بوپرائی بغداد میں، عراقی افواج کی تربیت کے لیے بھیجے گئے ایک یونٹ میں شامل تھا اور 2 سال اس نے عراق میں گزارے۔ واپس آکر بوپرائی نے ایک ایسا سنسنی آمیز انکشاف کیا کہ اگر وہ سچ ہے تو گرفتاری کے بعد ہائی سپیڈ گل پر کیا بیتی ؟ اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ بوہرائی کے مطابق " عراق میں قیام کے دوران ایک امریکی انسٹرکٹر سے میری دوستی ہو گئی تھی ۔۔۔ اس انسٹرکٹر نے ایک روز مجھے ایک ایسے بھارتی ہوا باز کی کہانی سنائی کہ جسے 1971 کی جنگ کی بعد پاکستان نے امریکہ کے حوالے کیا تھا۔ "لیکن ۔۔۔۔ بوپرائی کے پاس اپنے اس دعوے کو درست ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہ تھا۔

لیکن۔ یہ بات قطعاً خارج از امکان نہیں تھی۔ ان دنوں بھارت روس کا قریبی اتحادی تھا۔ اور پاکستان امریکہ کا اتحادی تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے فوراً بعد سے ہی امریکہ و روس کے درمیان ایک خفیہ نوعیت کی سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہر دو ممالک عرصہ دراز سے ایک دوسرے کی جنگی ٹیکنالوجی میں نقب لگانے ، ایک دوسرے کے ہتھیاروں کے حصول ، انہیں ڈی-کوڈ اور ریورس انجینئرنگ کرنے اور ان کا توڑ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوششوں میں مشغول تھے۔ مِگ سیریز اس دور میں روس کے جدید ترین جنگی طیاروں پر مشتمل سیریز تھی۔۔۔ اور ظاہر ہے روسی طیاروں کا توڑ کرنے کے لیے امریکہ کو ایسے طیاروں کے سیمپلز کے علاوہ ان کے ماہرین یا پائلٹس تک رسائی بھی بیحد ضروری تھی۔ لیکن امریکہ کا روس سے کسی روسی مگ پائلٹ کو اغواء کرنا بہت مشکل تھا
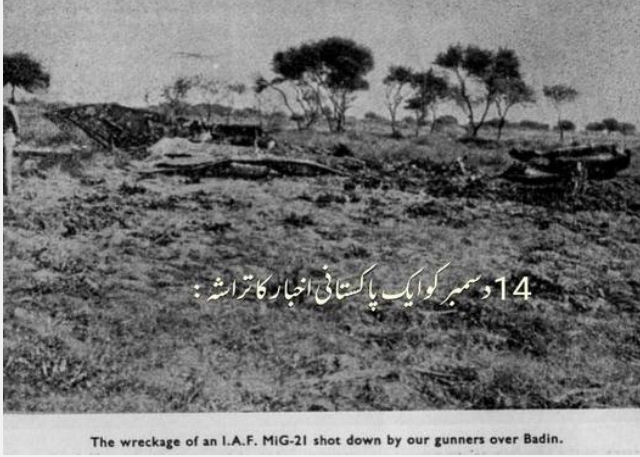
The wreckage of an I.A.F. MiG-21 shot down by our gunners over Badin.

چنانچہ بوپرائی کے مطابق امریکہ نے روس سے تربیت یافتہ بھارتی مِگ پائلٹ کی گرفتاری کی خبر ملتے ہی اس موقع کا فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی اور اس طرح ہائی سپیڈ گل کو امریکہ کے حوالے کر دیا گیا ہائی سپیڈ گل کا خاندان آج بھی اس کی واپسی کے لیے پر امید ہے۔

اگر وہ اب تک زندہ ہے تو یقیناً امریکہ میں ہی ہو گا اور اس کی عمر 90 کے قریب ہو گی۔

لیکن ظاہر ہے امریکہ نے اسے ہمیشہ حراست کی کیفیت میں ہی رکھا ہو گا اور اسے واپس بھیج کر امریکہ کبھی اپنے رازوں سے پردہ اٹھنا اور سبکی اٹھانا افورڈ نہیں کر سکتا۔

اس لیے، شاید یہ راز ہمیشہ ایک راز ہی رہ جائے۔

میرا نشانہ دیکھے زمانہ

"بلیڈ ٹرینیٹی" 2004 کی ایک معروف ایکشن فلم ہے جس میں "جیسیکا بیل" کے کردار کو بے انتہا پسند کیا گیا بالخصوص اس کی تیر اندازی اور فائیٹنگ سٹنٹس جو کہ، حیرت انگیز طور پر حقیقی تھے، نہ کہ تمثیل کاری یا ایڈیٹنگ کا نتیجہ۔ تاہم۔۔۔۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران ایک ایسا حادثہ پیش آگیا جس کا شاید کسی نے تصور بھی نہ کیا ہو گا۔ ہوا کچھ یوں کہ شوٹنگ کے دوران ایک سین ایسا تھا کہ جس میں جیسیکا بیل کو، بہترین آرچری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک تیر ٹھیک کیمرے کی سمت یوں فائر کرنا تھا کہ وہ کیمرے سے چند انچ کے فاصلے سے گزر جائے۔ لیکن وہ شوٹنگ کیمرہ انتہائی قیمتی اور مہنگا تھا۔۔۔ اور اگر تیر غلطی سے بھی اسے چھو جاتا تو اسے نقصان پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ کیمرے کو محفوظ کرنے کے لیے۔۔۔ "پلکس گلاس" کی شیٹوں سے مکمل طور پر ڈھک دیا گیا۔۔۔ جس میں محض کیمرے کے لینز کے لیے 2 سے 3 انچ کا سوراخ چھوڑا گیا۔ سین کا ٹائم آپہنچا۔۔۔ جیسیکا بیل نے اپنا تیر کمان سیدھا کیا اور شست لی۔

تصویر: جیسیکا بیل "بلیڈ ٹرینیٹی "فلم کی شوٹنگ کے دوران

لائیٹس۔۔۔۔۔۔ کیمرہ۔۔۔۔۔۔ ایکشن!!!

اور جیسیکا نے تیر چلا دیا۔۔۔ جو کہ سیدھا اس تین انچ کے سوراخ کے اندر سے ہوتا ہوا کیمرے کے لینز پہ لگا اور لینز کو پھاڑتا ہوا کیمرے کے ٹھیک اندر جا گھسا۔ 3 لاکھ ڈالر کا وہ کیمرہ، تین انچ کے خلا سے 3 سیکنڈ کے اندر تباہ ہو کر ناکارہ ہو گیا۔۔۔ وہ مرمت کے قابل بھی نہ تھا۔

جنگِ مہاراشٹر 2021

اس سیریز میں میں نے اب تک جتنے واقعات تحریر کیے ہیں وہ سب ماضی کے تھے۔۔۔ تاہم آج جو واقعہ بتانے جا رہی ہوں وہ آج کل جاری و ساری ہے۔

عام طور پر ایک ہی نسل کے دو جانوروں، یا دو مختلف نسلوں کے جانوروں کے آپس میں لڑنے جھگڑنے کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔۔۔۔ لیکن بھارتی ریاست مہاراشٹر میں ایک ماہ سے دو جانوروں یعنی بندروں اور کتوں کے درمیان ایک "فل سکیل جنگ" چھڑ چکی ہے جس میں ہلاکتوں / ہلاک۔کتوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے۔

مکیق Macaques بھارت میں پائی جانے والی بندروں کی ایک عام قسم ہے جس کا سائز 2 فٹ سے زیادہ اور وزن 11 کلو سے بڑھ سکتا ہے۔

ایک ماہ قبل مہاراشٹر کے علاقے "مجال گاؤں" میں چند آوارہ کتوں نے ایک مکیق بندر کے بچے کو بھنبھوڑ کے مار ڈالا۔۔۔ جس کے بعد غصے اور انتقام کی آگ میں جھلسے ہوئے بندروں نے کتوں کے خلاف وسیع پیمانے پر جنگ چھیڑ دی۔ بندروں کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ کتے کے پلوں یا پھر چھوٹے کتوں کو اٹھا کر کسی اونچی عمارت یا درخت کی چوٹی پر لے جاتے ہیں اور وہاں سے زمین پر دے مارتے ہیں۔ ایک ماہ کی ایک خونریز جنگ کے دوران اب تک 250 کتے اور پلے مارے جا چکے ہیں۔ وہیں ان کے کاٹنے سے کئی بندر بھی زخمی ہوئے ہیں۔ جنگ کا دائرہ کار اب مجال گاؤں سے نکل کر مضافاتی علاقے لاوول تک پہنچ چکا ہے جہاں ایک ماہ کے بندرانہ حملوں کے بعد اب ایک بھی پلا زندہ نہیں بچا۔ یہ جنگ کس قدر منظم ہے اس بات کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ مجال گاؤں کے رہائشیوں کے مطابق " بندر باقاعدہ ٹیمیں بنا کر علاقے میں گشت کرتے ہیں۔۔۔ اور جہاں بھی اس پیٹرولنگ ٹیم کو کوئی پلا یا چھوٹا کتا نظر آ جائے تو اسے حراست میں لے کر کسی قریبی عمارت یا درخت پر لے جاتے ہیں۔" کئی مرتبہ ایسے بھی ہوا کہ کسی انسان نے اپنے پالتو پلے کو چھڑوانے کے لیے بندوں سے الجھنے کی کوشش کی تو بندروں نے انہیں بھی زخمی کر دیا۔ بھارت کی سرکاری منکی کیچر ٹیموں کو متاثرہ علاقوں کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔۔۔ منکی کیچر بھارت میں ایک باقاعدہ ادارہ ہے جس کا مقصد سرکش بندروں کو پکڑ کے دور دراز علاقوں میں چھوڑنا ہے۔ حالات یہاں تک بھی رہتے تو قابلِ برداشت تھے لیکن اب مجال گاؤں کے رہائشیوں کے مطابق "کتوں کے ختم ہو جانے کے بعد اب بندروں نے انسان کے ننھے بچوں پر بھی نگاہ رکھنا شروع کر دی ہے

بشکریہ: نیوز 18، ڈیلی میل، نیویارک پوسٹ، ٹائمز ناؤ۔

ایجنٹ اورنج

زمانہ قدیم کی تاتاری، بربر اور وائی کنگ فوجوں کے بارے میں ہم یہ پڑھتے تھے کہ کسی ریاست پر حملہ آور ہونے کے بعد یہ افواج ان پر ایسا قتلِ عام اور مالی نقصان مسلط کرتی تھیں کہ جس میں مقہور قوم کی جان ومال سمیت کوئی چیز محفوظ نہ رہتی تھی۔۔۔ وہ انسانوں کو قتل کرنے اور غلام بنانے کے بعد ان کی بستیاں، فصلیں حتیٰ کہ درخت پودے تک تباہ یا نذرِ آتش کر دیتے تھے۔

اور ہم سوچتے تھے کہ ایسی بھی کیا بربریت کہ وہ جانوروں، فصلوں اور درختوں تک پہ اپنا قہر برسا ڈالتے تھے۔

یہاں تک کہ 1955 میں "جنگِ ویتنام" چھڑ گئی اور دنیا نے جو کچھ قصوں کہانیوں میں پڑھا تھا وہ سب اپنی آنکھوں سے دوبارہ دیکھا ۔عالمی جنگی قوانین سے لے کر تقریباً تمام مذاہب میں بھی دورانِ جنگ فصلوں، کھیتوں، درختوں کو تباہ کرنے یا نذرِ آتش کر دینے کی ممانعت ہے تاہم "مہذب" اقوام پر کسی قانون یا ضابطہ اخلاق کا نفاذ نہیں ہوتا۔

ویتنام جنگ کے دوران شمال ویتنامی افواج NVA اور ویت کونگ گوریلوں کا سب سے خطرناک اور تباہ کن ہتھیار "جنگل" تھا. ویتنامی مزاحمت کار ویتنام کے طول و عرض میں پھیلے انہی گھنے جنگلات کو چھپنے، دشمن پر ایمبش کرنے اور پھر سے غائب ہو جانے کے لیے نہایت کامیابی سے استعمال کر رہے تھے۔امریکہ اپنی تمام تر قوت اور جدید جنگی ٹیکنالوجی کی مدد سے جنوبی ویتنام کے شہروں پر تو قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن ویتنام کے جنگل جنگ کے پہلے دن سے آخری دن تک امریکی افواج کے لیے ایک "سبز جہنم" ثابت ہو رہے تھے کہ جہاں مزاحمت کاروں نے اپنی ہزاروں سرنگیں اور کمین گاہیں بنا رکھی تھیں۔۔۔ بیسیوں ہزار امریکی فوجی ویتنام کے انہی جنگلوں کی مٹی میں فنا ہو گئے یہ صورتحال امریکہ کے لیے انتہائی بے بسی اور فرسٹریشن کے ساتھ ساتھ شدید غیض وغضب کی باعث تھی۔ چنانچہ 1960 میں امریکہ نے ویتنام کو "جنگلات سے پاک" کرنے کے منصوبے پر کام شروع کر دیا ۔اس مشن کا ہدف "شمالی ویتنام کے جنگلات کے اکثریت رقبے کو ختم کر دینا" تھا جس کے مقاصد کچھ یوں تھے:

✓ تاکہ ویتنامی مزاحمت کار جنگلات کو چھپنے، حملہ کرنے اور ری-گروپنگ کے لیے استعمال نہ کر سکیں۔

✓ تاکہ امریکہ افواج کی نقل و حرکت اور دشمن پر نگاہ رکھنے میں آسانی ہو سکے۔

اس سلسلے میں پہلے تو امریکی افواج نے ویتنام کے جنگلات پر بڑی تعداد میں ڈیزی کٹر بم گرائے جو کہ پھٹنے کے بعد ہالے کی صورت

میں کئی مربع میٹر رقبے کو درختوں سے سے پاک کر دینے کی صلاحیت کے حامل تھے۔
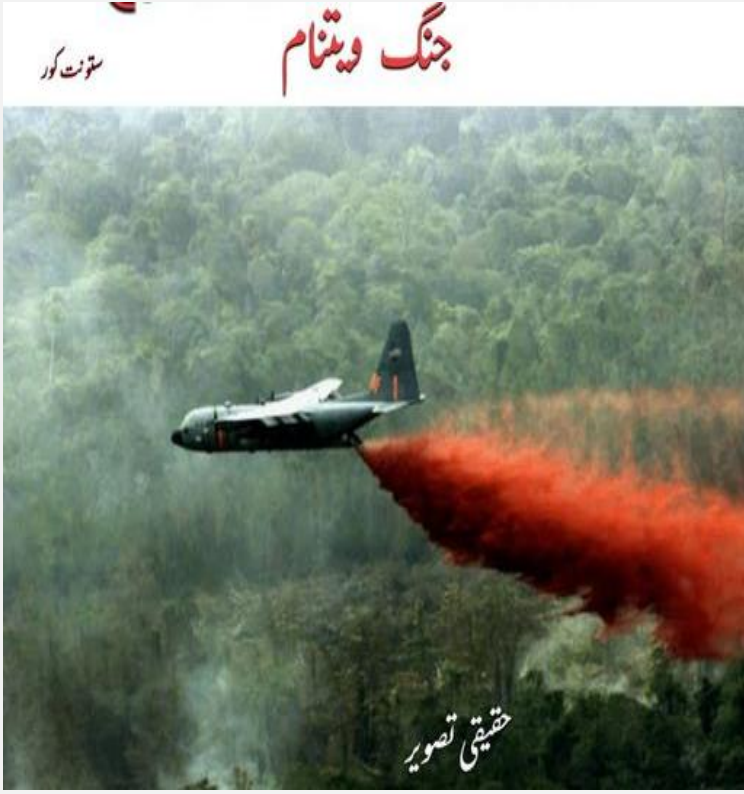
اس کے بعد امریکی فوج نے Tactical Tree Crusher نامی پچاسیوں ٹن وزنی درخت شکن مشینی گاڑیوں کا استعمال شروع کر دیا۔۔۔ لیکن یہ سب کافی وقت طلب کام تھا۔اور امریکیوں کا حوصلہ جواب دیتا جارہا تھا۔انہیں اب ضرورت تھی کسی تیز اور موثر طریقے کی ۔اس سلسلے میں "ہربیسائیڈز"یعنی نباتات کُش ادویات کا استعمال۔

1961 میں شروع کیے جانے والے اس آپریشن کو " آپریشن رینچ ہینڈ"کا نام دیا گیا۔پلان کے مطابق بھاری مقدار میں ہربیسائیڈ کیمیکلز کو طیاروں، ہیلی کاپٹرز کی مدد سے ویتنام کے جنگلات پر سپرے کیا جانا تھا۔۔۔جو کہ اپنی زد میں آنے والے ہر پودے، درخت، جھاڑی، گھاس کو ختم کر ڈالتی۔

اور اس مقصد کے لیے جس کیمیکل کا انتخاب کیا گیا وہ تھا" ایجنٹ اورنج ".ایجنٹ اورنج دراصل 2,4,5-acid Trichlorophenoxyacetic اور 2,4-Dichlorophenoxyacetic acid

کا مرکب ہے جو کہ ایک موثر نباتات کش دوا ہے۔

ایجنٹ اورنج کو ویتنام کے جنگلوں پر سپرے کرنے کے لیے Fairchild C-123 نامی ٹرانسپورٹ طیاروں کی فارمیشنز کا استعمال کیا جاتا تھا۔شروع میں ان کا شکار صرف جنگلات ہی تھے لیکن جنگ میں آگے چل کے امریکیوں نے جنگلات کے علاوہ چمرنگ (Mangroves) اور یہاں تک کہ ویتنام میں چاول کی فصلوں پر بھی بڑے بڑے پیانے پر اورنج ایجنٹ کا ہوائی چھڑکاؤ کیا۔

1961 سے لے کر 1971 تک:

✓ مجموعی طور پر اورنج ایجنٹ گرانے کے لیے 20 ہزار پروازیں کی گئیں۔

✓ان پروازوں میں "11 ملین لیٹر "زہریلا مواد ویتنام پر گرایا گیا۔

✓مجموعی طور پر "31لاکھ ہیکٹرز "رقبے پر سپرے کیا گیا۔

ایک بھیانک جھوٹ:

اس آپریشن کے آغاز سے قبل امریکی حکومت نے دنیا، بالخصوص جنوبی ویتنام کی کٹھ پتلی حکومت کو اس بات کی یقین دہانی کروائی تھی کہ "ایجنٹ اورنج ایک محفوظ ہربیسائیڈ ہے جس کے انسانی صحت پر کوئی بد اثرات مرتب نہیں ہوتے". لیکن آگے چل کر یہ جھوٹ یا پھر ممکن ہے غلط فہمی۔۔۔لاکھوں ویتنامی شہریوں اور ہزاروں امریکی اہلکاروں کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن کر ابھرنے والی تھی۔

ایجنٹ اورنج کے بد اثرات:

امریکی یقین دہانیوں کے برعکس ایجنٹ اورنج کا استعمال فی الحقیقت انسان کے لیے بیحد بھیانک اثرات کا حامل نکلا۔

چھڑکے جانے کے بعد یہ مرکب۔۔۔۔سانس، پانی یا خوراک کے زریعے انسان کے جسم میں داخل ہو سکتا تھا اور کم از کم 15 سخت نوعیت کی بیماریوں کا باعث تھا، بالخصوص:

1-دل کے امراض۔

2-کینسر۔

3-جلد کا سیاہ پڑ جانا۔

4-جگر کے امراض۔

5-اعصابی امراض۔

6-ہارمونز کے مسائل۔

7-سانس کے مسائل۔

8-جنسی صلاحیت سے محرومی اور بانجھ پن۔

9-پارکنسن۔

10-اولاد کا معذور اور بدہیئت پیدا ہونا۔

اور دیگر درجنوں چھوٹے بڑے مسائل۔

نقصانات (ویتنام):

∆ ویتنامی حکومت کے مطابق مجموعی طور پر 48 لاکھ افراد ایجنٹ اورنج سے متاثر ہوئے۔

∆ تقریباً 4 لاکھ ویتنامی شہری اس زہر افشانی کے باعث مارے گئے۔

∆ کم از کم 10 لاکھ شہری سخت نوعیت کے امراض کا شکار ہو گئے۔

∆ اورنج ایجنٹ کے اثرات کے باعث آج تک لاکھوں معزور بچے جنم لے چکے اور یہ سلسلہ "ابھی تک" جاری ہے۔

∆ لاکھوں درختوں اور فصلوں کی تباہی کے علاوہ ویتنام کے جنگلات میں پائی جانے والی جانوروں، پرندوں کی نایاب سپیشز کو پہنچنے والے نقصان کا تخمینہ لگا پانا شاید ممکن نہیں۔

نقصانات (امریکہ):

دورانِ جنگ امریکی اہلکاروں کو کوئی اندازہ نہیں تھا یہ کیمیکل خود ان کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔
چنانچہ اس کے اثرات سے بچنے یا نبٹنے کے لیے کوئی اقدامات نہ کیے گئے۔ جیسے کہ میں نے بتایا کہ یہ سپرے سانس، پانی، کھانے کے راستے انسان کے جسم میں جا سکتا ہے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق 40 ہزار امریکی فوجی بھی ایجنٹ اورنج سے متاثر ہوئے۔ لیکن 1979 ویتنام میں کام کر چکے "کئی لاکھ" امریکی اہلکاروں نے ایجنٹ اورنج کے خود پے پڑنے والے بد اثرات کے لیے مقدمہ دائر کر دیا۔۔۔ جس کے عوض 1984 میں امریکی حکومت نے انہیں 180 ملین ڈالرز کا ہرجانہ ادا کیا۔ اور ویتنام کو اس ساری تباہی کے عوض 1 ڈالر بھی نہیں ادا کیا گیا۔

مچھلیوں کی بارش

یہ حیرت انگیز واقعہ ماضی بعید کا نہیں بلکہ محض چند روز قبل ، ٹیکساس ، امریکہ کا ہے کہ جہاں کے رہائشی 30 دسمبر 2021 کے روز تب حیرت سے دنگ رہ گئے کہ جب آسمان سے برستی بارش نے صرف پانی کی بوندیں ہی نہیں بلکہ بڑی تعداد میں مچھلیاں بھی گرائیں۔

ہتھیلی کے سائز جتنی یہ مچھلیاں مشرقی ٹیکساس کے قصبہ Texarkana میں برسیں اور اس واقعہ کو لے کر سوشل میڈیا پر خوب چرچا ہورہا ہے۔۔۔ اس غیر معمولی بارش پر وہاں کے ایک رہائشی نے فیسبک پر کچھ یوں سٹیٹس لگایا کہ " آج سبھی آوارہ بلیلاں بہت خوش ہوں گی۔۔"

آسمان سے مچھلی کا برسنا کوئی نیا واقعہ نہیں بلکہ پہلے بھی کئی ممالک میں مچھلیوں ، کیکڑوں ، جھینگوں , جیلی فش، کیچووں حتیٰ کہ سانپوں اور سٹار فش تک کی بارش کے درجنوں واقعات ہوچکے ہیں۔

جیسا کہ:

18اگست 2004 کو ویلز۔۔۔ 12 فروری 2008 کو کیرالہ، انڈیا۔۔۔ 25 و 26 فروری 2010 کو آسٹریلیا۔۔۔ 6 مئی 2014 کو سری لنکا۔۔۔ 16 مئی 2016 کو کیلیفورنیا میں **مچھلیوں کی برسات۔**

اسی طرح 2009, 2010 اور 2011 میں بالترتیب جاپان ،
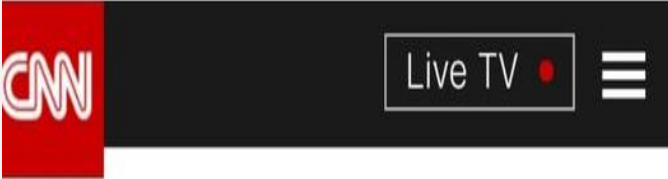
ہنگری اور یوراگوئے میں مینڈکوں کی بارش۔

2007میں لوزیانا، امریکہ میں کیچوؤں کی برکھا۔

یہاں تک کہ 13 جون 2018 کو شندونگ، چین میں آکٹوپس تک کی بارش۔

آج تک سب سے زیادہ مچھلی بارش انڈیا میں ہوئی کہ جہاں اوسطاً ہر پانچ سال میں ایک مرتبہ مچھلیاں برستی ہیں۔

لیکن یہ کیسے ہوتا ہے ؟

آخر جانوروں کا آسمان سے بارش کی طرح گرنا کیسے ممکن ہے۔۔۔۔اس سلسلے میں آج تک کوئی حتمی نتیجہ تو اخذ نہیں کیا جا سکا لیکن اس کا قریب ترین جواز " آبگولہ" یا Tornadic waterspout ہے۔۔۔۔

یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ جب انتہائی تیز ہوا ایک ٹورنیڈو کی صورت میں دائروی شکل میں اندھادھند گردش کرتے ہوئے کسی جھیل ، دریا یا سمندر پر سے گزرتی ہے تو وہ بڑی مقدار میں پانی کو کسی ویکیوم کی طرح اپنے اندر کھینچ لیتا ہے۔۔۔اور اس پانی کے ساتھ اس میں موجود مچھلیاں و آبی جانور بھی ساتھ چلے آتے ہیں۔۔۔۔یاد رہے کہ ٹورنیڈو اس قدر طاقتور ہوتا ہے کہ دو تین منزلہ مکانات کو چند سیکنڈ میں زمین سے اکھاڑ کے اپنے اندر سمو سکتا ہے اور لاکھوں ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی طاقت رکھتا ہے تو چند سو گیلن پانی کو اٹھانا اس کے لیے قطعاً کوئی مشکل نہیں ----

چنانچہ جب یہ آبگولہ خود میں پانی اور مچھلیاں سما کر آگے بڑھتا ہے اور ایک خاص مدت بعد اس کی طاقت میں کمی ہو جاتی ہے تو پھر یہ پانی کا وزن برداشت نہیں کر پاتا اور وہ پانی بارش کی طرح زمین پر جا برستا ہے اور ظاہر ہے اس کے ساتھ مچھلیاں ڈڈو کیکڑے وغیرہ بھی۔

شیئر کرنا مت بھولیے۔۔۔۔۔

انوکھا چور

اگر آپ نے نمرہ احمد کا ناول "حالم" پڑھا ہے تو یقیناً آپ Scam اور Scammer کی اصطلاحات سے خوب اچھی طرح آگاہ ہوں گے۔

تاہم آج ہم بات کرنے جارہے ہیں ایک ایسے سکامر کا کہ 100 حالم مل کر بھی اس کے عشرِ عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

ایمانول نودے Emmanuel Nwude کا تعلق نائجیریا سے ہے۔۔۔۔انہیں تاریخ کا سب سے بڑا سکام کھیلنے کا اعزاز حاصل ہے۔

ایمانول ایک بنکار تھا اور وہ "یونین بنک آف نائیجیریا" میں بطورِ ڈائریکٹر کام کرتا تھا۔۔

ایمانول، اپنی آمدنی سے خوش نہ تھا بلکہ اس کے "خواب" بہت بڑے تھے۔۔۔اور ان خوابوں کی تکمیل کے لیے اسے کوئی جائز زریعہ نہیں سجھا رہا تھا۔

جس بنک میں وہ بطورِ افسر کام کررہا تھا وہاں غبن کرنا اس کے لیے کچھ خاص مشکل نہ تھا۔۔لیکن ۔۔۔وہ چند لاکھ یا بیسیوں لاکھ ڈالرز کے غبن پے "مطمئن" نہ تھا۔۔چنانچہ اس نے ایک بڑا ہاتھ مارنے کا فیصلہ کیا!!

برازیل کا بنک Banco Noroeste بنک جو کہ ساؤ پاؤلو میں قائم تھا اس کے ساتھ یونین بنک آف نائیجیریا کا عرصہ دراز سے معمول کا لین دین چلتا تھا۔۔۔ 1995 میں ایمانول نے Banco Noroeste کے ڈائریکٹر Nelson Sakaguchi کے ساتھ ایک منصوبہ ڈسکس کیا کہ جس کے مطابق نیلسن کے بنک کو نائجیریا میں ایک نئے ائیرپورٹ میں سرمایہ کاری کی ترغیب دی گئی۔۔۔یہ ایک پرکشش موقع تھا کیونکہ ائیرپورٹ ایک سرکاری اثاثہ ہونے کے ناطے اس میں انویسٹمنٹ محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین منافع کا باعث بن سکتی تھی۔

چنانچہ بینکو نوروست، برازیل نے اس منصوبے میں سرمایہ کاری کے لیے گرین سگنل دے دیا۔۔

اس سلسلے میں ایمانول کو " 2 کروڑ 42 لاکھ" امریکی ڈالرز کی فراہمی کی گئی۔

لیکن نیلسن سے ایک "چھوٹی سی" غلطی ہوگئی۔۔۔۔اور وہ یہ کہ اس نے ایک خالی قطعہ زمین کی تصاویر اور ممکنہ ائیرپورٹ کے نقشے و بلیو پرنٹس کے عوض اس قدر بھاری قرضہ تو یونین بنک آف نائیجیریا کو فراہم کردیا لیکن اس

منصوبے کی نائیجری حکومت سے تصدیق کروانے کی الگ سے کوئی زحمت نہ کی ، کیونکہ اسکے نزدیک ایک سرکاری بنک سے ہوئی ڈیل ہی اس کی شفافیت کو یقینی بنانے کے لیے کافی ہے۔

لیکن۔۔۔۔یہ ایک سکام تھا!!

ایمانول نے نیلسن کو جو ائیرپورٹ "بیچا" تھا اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔

1997میں اس بات کا انکشاف ہوا کہ بینکو نوروست کے ساتھ "ہاتھ" ہوگیا ہے چنانچہ اس فراڈ کی چھان بین اور انویسٹیگیشن شروع کردی گئی۔

2001میں بینکو نوروست دیوالیہ ہوکر ختم ہوگیا ۔۔۔۔

2004میں ایمانول کو گرفتار کرلیا گیا اور اوپر فراڈ کا مقدمہ چلایا گیا۔

ایمانول کو 25 سال قید کی سزا سنائی گئی ہے۔۔۔۔تاہم اس کی طرف سے غبن کیے گئے 242 ملین ڈالرز کا اکثریت حصہ کبھی ریکور نہ کیا جاسکا۔

2015میں اس نے اپنی سزا کے خلاف اپیل کردی۔۔۔

2016میں ایمانول کو ضمانت پر رہا کردیا گیا۔

اور یہ مقدمہ ابھی تک کسی حتمی فیصلے تک نہیں پہنچ سکا۔

جب بھی ایمانول کی بری کیا گیا تو وہ اپنی باقی زندگی کسی لارڈ کی طرح بےانتہا عیش و عشرت میں گزارنے کے قابل ہو گا۔۔۔۔

نیلا شہد

2012میں شمالی فرانس کے کچھ شہد سازوں کی پالتو مکھیوں نے اچانک سے نیلے اور سبز رنگ کا شہد بنانا شروع کردیا۔

شہد کی یہ نیلی اور سبز رنگت واضح اور شوخ تھی۔۔۔
اس سے قبل کسی نے آج تک نیلا یا ہرا شہد نہیں دیکھا تھا اور
اس واقعے نے شہد سازوں کو حیرت و تشویش میں مبتلا کردیا کہ۔۔۔
کیا وہ مکھیاں کسی نئی طرز کی بیماری کا شکار ہیں جس میں شہد کا رنگ بدل گیا ؟
کیا ماحول میں کوئی ایسا کیمیکل یا گیس سرائیت کر رہا ہے کہ جس نے شہد کی رنگت بگاڑ دی ؟
کیا یہ کسی بائیولوجیکل تجربے کا نتیجہ ہے ؟
اور اس سے بھی بڑھ کے۔۔۔۔کہیں یہ شہد زہریلا تو نہیں ؟
چنانچہ شہد کے سیمپلز کو ٹیسٹ کے لیے لیبارٹری میں بھجوا دیا گیا۔۔۔۔
لیبارٹری میں اس منفرد شہد کے تجزیے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ " یہ شہد محفوظ اور قابل استعمال ہے۔۔۔اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں۔"
چکھنے پر اس شہد کا ذائقہ تو عام شہد سے بھی کہیں زیادہ لذیذ نکلا۔۔۔
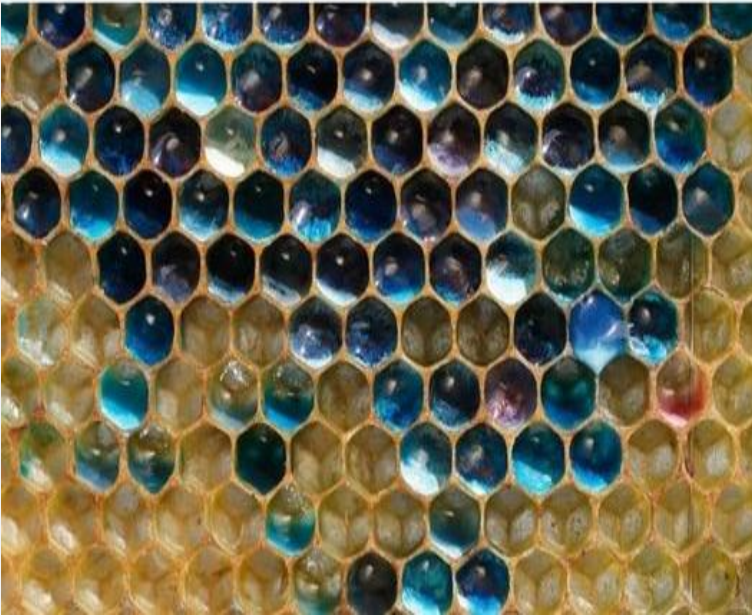
لیکن وجہ کا تعین اب تک باقی تھا۔۔۔نیلے و سبز شہد کی پروڈکشن کے سب سے زیادہ واقعات Ribeauville نامی قصبے میں ہورہے تھے۔

اسی قصبے کے نزدیک ایک بائیوگیس پلانٹ بھی قائم ہے۔۔۔۔شہد سازوں نے اس تغیر کی وجہ اس پلانٹ کو قرار دیا۔

لیکن ماہرین نے اس بات کو مسترد کردیا۔

آخرکار۔۔۔۔شہد کی مکھیوں کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا گیا، اب ظاہر ہے ان کا تعاقب کرنا کونسا آسان بات تھی ؟ تاہم یہ طریقہ رنگ لایا اور کچھ دن بعد ایک ایسا انکشاف ہوا کہ جس نے شہد سازوں کو اپنا سر پیٹ لینے پے مجبور کردیا۔۔۔پتا چلا کہ یہ مکھیاں ایک نزدیکی فیکٹری میں بہت آیا جایا کرتی ہیں۔اس فیکٹری میں مشہور رنگ برنگی میٹھی کینڈی M&M کی پروڈکشن کی جارہی تھی۔۔۔۔اور ان مکھیوں کو اس کا رنگ برنگا سیرپ کھانے کا چسکا پڑ گیا تھا۔۔۔یہ چٹوری مکھیاں اب پھولوں کا رس چوسنے یا شہد سازوں کا فراہم کردہ مخصوص شیرہ پینے کی بجائے روزانہ جاکر کینڈی سیرپ پی پلا کر آیا کرتی تھیں۔۔۔۔اور اس کے اثرات براہِ راست شہد کی رنگت و گاڑھے پن پے پڑ رہے تھے۔

Weldone Legend Bees

کارآمد پُل

ہنڈوراس، وسطی امریکہ کا ملک ہے جو
کہ اکثر و بیشتر سیلاب، زمینی کٹاؤ اور طوفان
جیسی قدرتی آفات کا شکار بنتا رہتا ہے۔ ایسا
ہی ایک متاثرہ شہر Choluteca ہے جو
دریائے چولوٹیکا کے کنارے واقع
ہے۔۔۔ ہر برس طغیانی کے دنوں میں دریا کا
پاٹ چوڑا ہو جاتا تھا اور مہینوں تک اسے
عبور کرنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ
حکومت نے 1996 میں ایک جاپانی
کنسٹرکشن کمپنی کے زریعے دریا کے اس
حصے پر ایک 484 میٹر طویل پل تعمیر کروانے کا قصد کیا اور یہ پل 1998 میں مکمل ہوا۔۔۔ اس کی تعمیر پر دسیوں
لاکھ ڈالرز کے مساوی لاگت آئی۔

پھر چند ماہ بعد اکتوبر 1998 میں ہنڈوراس کو ایک سمندری طوفان Hurricane Mitch نے آن گھیرا۔۔۔ اس
دوران خطرناک حد تک زیادہ، 1500 ملی میٹر بارشیں ہوئیں اور دریائے چولوٹیکا نے ارد گرد کے علاقوں میں سیلاب
کی صورت میں تباہی مچادی۔

اور جب طوفان تھمنے کے بعد دریا میں طغیانی ختم ہوئی۔۔۔۔ تو دریا کے رخ تبدیل ہو چکا تھا۔

تب سے اب تک یہ پل یوں ہی بے مصرف کھڑا ہے۔

تلاشِ گمشدہ

یہ واقعہ ہے 2012 کا جب آئس لینڈ میں سیاحوں کا ایک گروپ Eldgja canyon نامی ایک انتہائی خوبصورت مگر دشوار گزار سیاحتی مقام کی سیر پر عازم تھا۔

کافی دیر تک اس خوبصورت اور سرسبز مقام کی سیاحت کے بعد جب وہ اب واپس پہنچے تو انہیں احساس ہوا کہ ایک سیاح لڑکی ، جو جاتے وقت ان کے ساتھ تھی واپسی پے ان کے درمیان موجود نہیں۔۔۔کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب وہ لڑکی روانگی کے لیے تیار بس میں واپس نہ پہنچی تو ان سیاحوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی ، کیونکہ وہ دشوار گزار پہاڑی علاقہ ایک تنہا لڑکی کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا تھا۔

چنانچہ اس کی تلاش کے لیے واپس وہیں جانے کا فیصلہ کیا گیا ، تلاش کرنے والوں کو اس لڑکی کا نام معلوم نہ تھا۔۔۔کیونکہ یہ گروپ مختلف قومیتوں کے مختلف لوگوں پر مشتمل تھا جو صرف ایک بس پر وہاں آنے کی وجہ سے ایک گروپ میں ڈھل گئے تھے۔۔۔اس لڑکی کی نشانی بس یہی تھی کہ وہ ایشیائی نقوش کی حامل ہے، قد 5 فٹ 2 انچ کے قریب، اور اس نے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا اور وہ انگلش روانی سے بول لیتی ہے۔۔۔گمشدہ لڑکی کی تلاش میں جانے والے اس ٹیم میں Reykjavik Grapevine نامی ایک خاتون بھی شامل تھی۔۔۔جو کہ اس سیاحتی گروپ میں شامل ہونے کی وجہ سے اپنی ایک ہمراہ لڑکی کی گمشدگی پر فکرمند تھی اور اب اس کی تلاش کے لیے خود

بھی کمربستہ تھی۔
چند گھنٹے کی تلاش کے بعد بھی جب اس کا کوئی سراغ نہ ملا تو پولیس اور ریسکیو سینٹرز کو اطلاع کردی گئی۔۔۔۔
جلد ہی پولیس اہلکاروں ، ریسکیو ٹیموں اور بیسیوں والنٹیئرز پر مشتمل مہم اس گمشدہ لڑکی کو پوری تندہی کے ساتھ تلاش کرنے میں لگ چکی تھی۔
جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا ان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔۔۔مقامی پولیس چیف وہاں پہنچ چکا تھا اور بذات خود ریسکیو آپریشن کی نگرانی کررہا تھا۔
اگر رات پڑ جاتی تو اس ویران ، سرد اور دشوار گزار علاقے میں اس گمشدہ لڑکی کا زندہ بچ پانا محال تھا۔۔۔ چنانچہ سرچ آپریشن کے لیے ہیلی کاپٹر بھیجنے کی درخواست کردی گئی۔
ساتھ ہی پولیس نے اس لڑکی کا نام اور دیگر ضروری کوائف جاننے کے لیے ٹورسٹ رجسٹریشن سینٹر سے بھی رابطہ کرلیا تاکہ وہ وہاں محفوظ اس کی تصویر کی مدد سے اس کا نام، قومیت و دیگر تفصیلات سے آگاہ ہوسکیں۔۔۔ٹورسٹ سینٹر والوں نے جو تصاویر میل کیں ان میں سے ایک تصویر کو وہاں موجود اس گروپ کے کئی سیاحوں نے پہچان لیا، اور ساتھ نام درج تھاReykjavik Grapevine ۔۔۔۔تصویر دیکھتے ہی سب کی نگاہیں وہیں موجود اور کئی گھنٹوں سے "گمشدہ لڑکی" کی تلاش میں ان کے ساتھ مصروف Reykjavik کی طرف اٹھ گئیں۔۔۔
معلوم ہوا کہ وہ گمشدہ سیاح کوئی اور نہیں بلکہ Reykjavik ہی تھی۔۔۔ہوا کچھ یوں تھا کہ جب وہ مذکورہ علاقے میں گھوم پھر کر فوٹوگرافی کررہی تھی تو پھسل کر گر جانے کی وجہ سے اس کا لباس کیچڑ آلود ہوگیا تھا۔۔۔ چنانچہ اس نے ایک بڑی چٹان کی اوڑھ میں جا کر اپنے بیگ میں موجود دوسرا لباس نکالا اور اسے پہن کر کیچڑ آلود لباس بیگ میں ڈال دیا۔۔۔اور جب وہ اس نئے لباس کے ساتھ واپس آئی تو اس گروپ کے لوگوں نے " کالے جئے لباس دی شوقینڑ کڑی۔۔۔"کو واپس آتے نہ دیکھا اور اس طرح اسے گمشدہ سمجھ لیا گیا۔۔۔کسی کو اس کا نام نہ یاد ہونے کی وجہ سے کوئی سمجھ ہی نہ پایا کہ آخر کون کھویا ہے ورنہ نام لینے پر تو وہ فوراً بول پڑتی کہ بھئی کسے ڈھونڈ رہے ہو میں تو یہیں ہوں۔۔۔۔
چنانچہ وہ خدا کی نیک بندی شام 3 بجے تک باقی سیاحوں ، پولیس اور ریسکیو کے ساتھ مل کر ان سرسبز مگر پتھریلی گھاٹیوں میں خود کو خود ہی ڈھونڈنے میں لگی رہی۔۔۔اور یوں آخر کار اس نے خود کو پا لیا۔
شیئر کرنا مت بھولیے۔۔۔

جیسا کروگے

2فروری2016 کی صبح 11 بجے صومالیہ کے دارالحکومت مقدیشو سے Daallo Airlines کی فلائیٹ 159- نے اڑان بھری۔۔۔اس کی منزل جبوتی کا دارالحکومت جبوتی تھا۔ جہاز میں عملے کے 7 اراکین سمیت 81 افراد سوار تھے۔۔۔۔اور انہی میں سے ایک تھا "عبداللہ عبد سلیمان بورلے" جو کہ دراصل دہشت گرد تنظیم ا°لشبا°°ب کا آپریٹو تھا۔۔۔اور اس کا ہدف تھا جہاز میں بم حملہ کر کے اسے فضا میں ہی تباہ کر دینا۔ اس حملہ آور نے د°ھماکہ خیز مو°اد ایک لیپ ٹاپ میں چھپار کھا تھا اور اسی وجہ سے اسے ڈیٹیکٹ نہیں کیا جاسکا اور بورلے، لیپ ٹاپ سمیت جہاز پر سوار ہو جانے میں کامیاب ہو گیا۔۔۔اڑان بھرنے کے کچھ دیر بعد ہی جب جہاز 14000 فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا اور ایک زوردار دھماکے سے پورا جہاز لرز کے رہ گیا۔

اس دھماکے کے نتیجے میں جہاز کی باڈی میں سوراخ ہو گیا اور ہوا کے شدید پریشر سے ایک مسافر اڑ کر اس سوراخ سے باہر چلا گیا اور ہزاروں فٹ کی بلندی سے زمین کی طرف گرنے لگا۔ ایمرجنسی کے پیش نظر پائلٹس نے فوری طور پر جہاز کا موڑ کر مقدیشو انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی طرف کر دیا۔۔۔اور نصف گھنٹے بعد جہاز خوش قسمتی سے صحیح سلامت لینڈ کر گیا۔ اس دھماکے میں صرف ایک ہی شخص کی موت ہوئی کہ جو اس سوراخ سے باہر اڑ گیا تھا۔۔۔اور وہ تھا عبداللہ بورلے۔

باقی سبھی مسافر صحیح سلامت بچ نکلے جن میں سے صرف 2 کو معمولی چوٹیں آئیں۔

صنفِ آہن

یُسریٰ مردینی Yusra Mardini پانچ مارچ 1998 میں شام کے شہر درایا میں پیدا ہوئیں۔

2011میں جب ان کی عمر محض 13 برس تھی تو ان کا ملک انسانی تاریخ کی خونریز ترین خانہ جنگیوں میں سے ایک کا شکار ہوگیا۔۔۔اس وقت یُسریٰ ساتویں جماعت کی طالبہ تھی۔

2012میں یُسریٰ کے شہر درایا میں ایک خوفناک جنگ بھڑک اٹھی کہ جب حریت پسندوں نے اسے قابض سرکاری افواج سے آزاد کروانے کی کوشش کی۔۔جواب میں قابضین نے درایا کو فضائی حملوں اور توپخانے کی بمباری سے راکھ و خون کے دلدل میں بدل دیا۔

یُسریٰ بتاتی ہیں " طویل عرصے تک ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا ماسوائے درخت کے پتوں کو ابال کر کھانے کے."

2015تک یہ تباہ کن جنگ ان کے محلے تک آپہنچی اور ایک روز قابض فوج کی بمباری سے ان کا گھر تباہ ہوگیا۔

بھلے ہی بمباری کے وقت وہ سب گھر میں موجود نہ تھے لیکن چند دن بعد قابض فوج نے یُسریٰ کے والد کو گرفتار کرلیا اور انہیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا۔۔۔ایسے میں یُسریٰ کی ماں نے یُسریٰ اور اس کی بڑی بہن 17 سالہ سارہ کو شام سے باہر کسی محفوظ مقام پر بھیجنے کا فیصلہ کیا زخمی ہونے کی وجہ سے وہ خود انخلاء کے قابل نہ تھی۔۔۔پلان کے مطابق دونوں بہنوں کو کچھ قریبی رشتے داروں کے ساتھ بوٹ میں ترکی کے ساحل تک جانا تھا جس کے بعد وہ کسی پناہ گزین کیمپ تک پہنچ پاتے۔

مقررہ دن بوٹ تک پہنچنے اور اس میں سفر کیے انہیں 15 منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس پرانی بوٹ کا انجن بند ہوگیا، جسے دوبارہ سٹارٹ بھی نہ کیا جاسکا صاف ظاہر تھا کہ وہ ناکارہ ہوچکا ہے۔۔۔7 افراد کی گنجائش رکھنے والی اس کشتی پر 20 پناہ گزین سوار تھے۔

سمندر کا پانی شدید سرد ہونے کے ساتھ ساتھ اس روز لہریں بھی بہت تیز اور طاقتور تھیں۔۔۔اور کھلے سمندر میں نہ تو ان سب کے پاس کوئی خوراک تھی نہ ہی گرم کپڑے۔

یُسریٰ اور سارہ کے والد ایک معروف تیراک تھے اور شام کی قومی تیراکی ٹیم میں بھی رہ چکے تھے۔۔۔انہوں نے

اپنی دونوں بیٹیوں کو بھی تیراکی کی تربیت سے آراستہ کرر کھا تھا۔

چنانچہ سارہ ، یُسریٰ اور 2 مزید پناہ گزین کہ جو تیراکی جانتے تھے اس یخ بستہ پانی میں اترے اور خود تیرتے ہوئے بوٹ کو دھکیلنے کی کوشش میں مگن ہوگئے کیونکہ یہ ان سمیت 20 افراد کی زندگی کا سوال تھا۔۔۔16 اور 17 سال کی دو بچیوں کی بساط ہی کیا تھی مگر انہوں نے اپنی ہمت سے کہیں بڑھ کر اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔۔۔ مسلسل تین گھنٹے تک دونوں بہنیں اپنے وجود کی پوری طاقت کے ساتھ اس جان توڑ کام میں مگن رہیں۔۔۔اور کچھ کام لہروں نے کر دکھایا۔
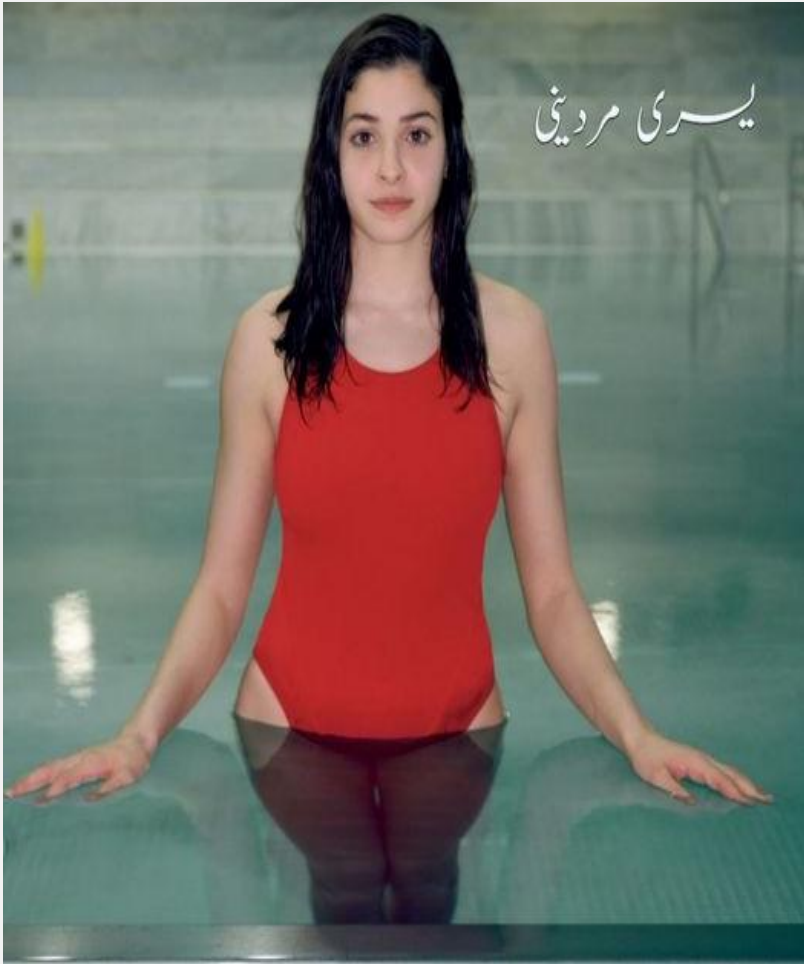
یہاں تک کہ کشتی ، ترکی تو نہیں مگر بمشکل تمام ایک چھوٹے سے جزیرہ کے اتنا قریب پہنچ جانے میں کامیاب ہوگئی کہ سب پناہ گزین کشتی سے اتر کر اس جزیرے تک تیرنے کی ہمت کر سکتے تھے۔

یہ جزیرہ تھا Lesbos جو کہ یونان کے زیرِ انتظام ہے۔

لیکن یونان ان کی منزل نہ تھا ابھی ایک طویل اور سخت دشوار سفر باقی تھا۔۔۔ ستمبر 2015 دونوں بہنیں دیگر پناہ گزینوں کے ساتھ جرمنی پہنچنے میں کامیاب ہوگئیں جہاں انہیں ایک پناہ گزین کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔

کیمپ کی زندگی بہت بےرونق اور محدود تھی۔۔۔یہاں تک کہ یُسریٰ کو برلن میں ایک ایسے ادارے کا علم ہوا کہ جو پناہ گزینوں کو سپورٹس کی تعلیم اور تربیت دے رہا تھا۔۔۔یُسریٰ جو کہ نہ صرف پہلے سے ہی ایک اچھی تیراک تھی بلکہ مشکل ترین حالات میں بھی اپنی اور دیگر ساتھیوں کی جان بچانے کے لیے اس ہنر کا استعمال کر چکی تھی اس نے فوراً موقع سے فائیدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اس ادارے میں شمولیت اختیار کر لی۔۔۔

جون 2016 میں یُسریٰ کو " ریفیوجیز اولمپکس ٹیم" کے لیے منتخب کر لیا گیا۔

اگست 2016 میں برازیل میں منعقد کی جانے والی "رِیو سمر اولمپکس" میں یُسریٰ نے تیراکی کے کمال جوہر دکھاتے ہوئے 100 میٹر کی سوئمنگ ریس میں پہلا نمبر حاصل کیا۔

یُسریٰ نے 2020 کے ٹوکیو اولمپکس کے لیے بھی کوالیفائی کیا اور وہاں بھی بےمثال کارکردگی کا مظاہرہ کیا بھلے ہی وہ اس دوران کوئی تمغہ نہ حاصل کر سکیں۔

2020 کے بعد یُسریٰ نے فی الوقت تعلیم کی خاطر اپنے سوئمنگ کیرئیر کو وقفہ دے رکھا ہے۔

خوش قسمتی سے یُسریٰ و سارہ کے والدین بھی بحفاظت جرمنی پہنچ جانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔۔۔اب پھر سے وہ سب ایک ساتھ ہیں۔

اور آج کل یُسریٰ مردینی دنیا کی کم عمر ترین UNHCR Goodwill Ambassador کی حیثیت سے کام کررہی ہیں ان کی دلیری و استقامت پر Butterfly– from Refugee to Olympian نامی ان کی ایک کتاب شائع ہوچکی ہے۔۔

صدیوں کا زخم

بوہیڈ وہیل Bowhead whale دنیا کے سب سے بڑے ممالیہ جانوروں میں سے ایک ہے جس کا سائز 60 فٹ جبکہ وزن 1 لاکھ 20 ہزار پاؤنڈ سے بھی بڑھ سکتا ہے۔۔۔یہ وہیل کافی طویل العمر سمندری جانور ہے۔

کچھ عرصہ پہلے یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ اس کی عمر 70 سال تک ہوسکتی ہے۔لیکن۔۔۔

پھر 2007 میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے ماہرین کو دنگ کر دیا۔۔۔
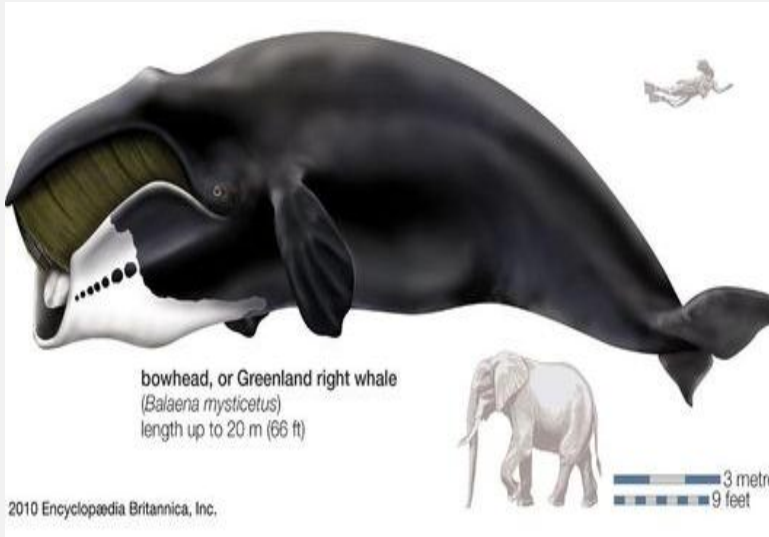
ہوا کچھ یوں کہ الاسکا کے نزدیک بحرالکاہل میں کچھ مقامی اسکیموز نے ایک بوہیڈ وہیل کا شکار کیا ۔۔۔شکار کرنے کے بعد جب اسے کاٹا جارہا تھا تو اس کے جسم میں ایک پرانا ہارپون برآمد ہوا۔ جسے انہوں نے میساچوسٹس میں میرین بائیولوجی کے ایک تحقیقی ادارے کو بھجوا دیا۔۔۔

ماہرین نے جب اس خستہ حال ہارپون کا تجزیہ کیا تو یہ جان کر انہیں حیرت کا دھچکا لگا کی یہ ہارپون ایک مخصوص کمپنی کا تیار کردہ ہے جو وکٹورین دور میں ہی بن کر ختم ہوچکی تھی۔۔۔یہ مخصوص ساخت کا ہارپون ایک پیٹنٹ پراڈکٹ تھا یعنی کسی اور کمپنی کا تیار کردہ نہیں ہوسکتا تھا۔

لیکن پھر بھی تحقیق کے تقاضوں کے پیش نظر ہارپون کو تفصیلی تجزیے کے لیے لیب بھجوادیا گیا۔۔۔جہاں سے اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ یہ ہارپون 100 سے 130 سال قبل وہیل کو مارا گیا تھا۔

تخمینے کے مطابق پر اسے 1880 کی دہائی میں داغا گیا تھا۔

اور نہ صرف اس کے بعد ایک صدی سے زیادہ وقت وہ وہیل زندہ رہی بلکہ 2007 میں جب اسے شکار کیا گیا تو صحیح سلامت اور صحت مند تھی۔

اس واقعہ نے بوہیڈ وہیل کی عمر سے متعلق سبھی پرانے اندازوں کو غلط ثابت کردیا ہے۔